الرسالہ

Al-Risāla

June 2005 • No. 343 • Rs. 10

چھوٹا کام کرنا ہو تب بھی اس کو بڑے منصوبہ کے ساتھ شروع کرو۔

تذکیر القرآن

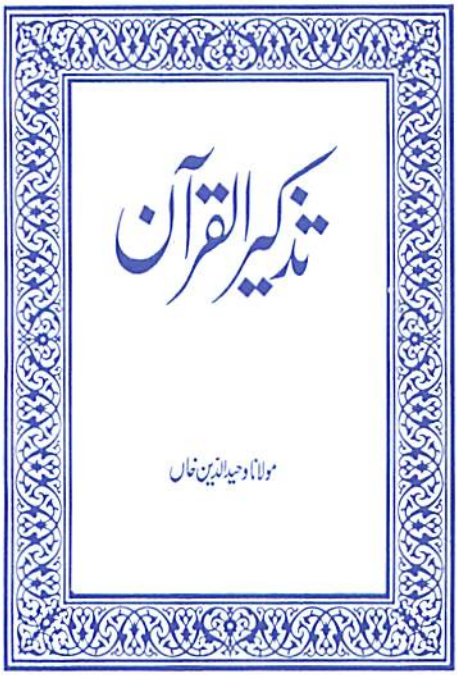

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ: ۴۰۰ روپے (ہارڈ باؤنڈ)

۲۵۰ روپے (پیپر بیک)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

جون 2005

فہرست

سفری کلاس (Class on Wheels) 2

خدا کے گواہ 40

انسان کی منزل 42

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 5454
Fax: 2435 7333
email: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $20 (Air Mail)

Distributed In England by
IPCI: Islamic Vision
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

Distributed in the USA by
Al-Risala Forum International
2665 Byberry Rd.
Bensalem, PA 19020 (USA)
Tel/fax: 215-639-3584
e-mail:caleem@juno.com

Printed and published
by Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

New Release!

سفری کلاس

Class on Wheels

ہمارا پہلا سفری کلاس جون ۲۰۰۴ میں ہوا تھا۔ اس سفر میں میں اپنی ٹیم کے کچھ افراد کے ساتھ دہلی سے بلند شہر گیا تھا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ نومبر ۲۰۰۴ میں شائع ہو چکی ہے۔ ہمارا دوسرا سفری کلاس نومبر ۲۰۰۴ میں ہوا۔ اس سفر میں ہم لوگ ۲۷ نومبر کو کار کے ذریعہ دہلی سے سہارن پور گئے اور ۲۸ نومبر کو وہاں سے واپس ہوئے۔ اس سفری کلاس میں ہماری ٹیم کے جو افراد شریک تھے ان کے نام یہ ہیں:

نغمہ صدیقی، خالد انصاری، رجت ملہوترہ، اقبال پردھان، نصرت الٰہی، استھی ملہوترہ، منجو ورمانی، پریا ملک، فریدہ خانم۔

۲۷ نومبر کی صبح کو دہلی سے روانگی ہوئی۔ راقم الحروف سمیت اس ٹیم میں کل دس افراد شریک تھے۔ سب لوگ ایک ہی بڑی گاڑی میں بیٹھے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، ٹیم کا ہر فرد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر گاڑی میں داخل ہوا۔ میں نے کہا کہ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ جب بھی کوئی کام شروع کیا جائے تو پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا جائے۔ اس کلمہ کے معنی ہیں--- شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے:

In the name of God Almighty, most merciful, most compassionate.

یہ کلمہ خدا کی دو صفات کو یاد دلاتا ہے، ایک اس کا قادر مطلق ہونا اور دوسرا اس کا شفیق اور مہربان ہونا۔ اس طرح یہ کلمہ ہم کو یاد دلاتا ہے کہ جس خدا کے حوالے سے ہم اپنا کام شروع کر رہے ہیں وہ ایک طاقتور خدا ہے۔ وہ ہر کام کو تکمیل تک پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے۔ کوئی بھی اس کے راستے میں روک بننے والا نہیں۔

یہ کلمہ خدا کی جس دوسری صفت کو یاد دلاتا ہے وہ اس کا شفیق اور مہربان ہونا ہے۔ کلمہ کا یہ دوسرا جزء ہمارے لیے امید کا سرچشمہ ہے۔ یہ ہم کو یقین دلاتا ہے کہ جس خدا کو ہم نے اپنا خدا بنایا ہے وہ ہمارے لیے ماں اور باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ وہ ہماری پکار کو سنے گا اور ہماری لغزشوں کو معاف کرتے ہوئے ہم کو اپنی مدد پہنچاتا رہے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ: **کل امر ذی بال لم یبدأ فیه بسم الله الرحمن الرحیم اقطع** (ہر اہم کام جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر شروع نہ کیا جائے وہ کٹا ہوا ہے) یعنی ایسا کام اپنی جڑ سے کٹا ہوا ہے۔ اس کا مطلب صرف کلمہ کا تلفظ نہیں ہے بلکہ کلمہ کی اسپرٹ ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی حیثیت صرف کلمۂ آغاز کی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت پورے عمل میں کارفرما اسپرٹ کی ہے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے میں نے ایک قصہ سنایا۔ میں نے کہا کہ بحری جہاز رانی کے دور میں ایک بحری جہاز امریکا کے ساحل سے افریقہ کے لیے روانہ ہوا۔ جہاز جب اٹلانٹک سمندر کے درمیان پہنچا تو سخت طوفان آ گیا۔ جہاز تیزی سے ہلنے لگا۔ تمام مسافر پریشان ہو گئے۔ ایک مسافر گھبراہٹ میں ادھر سے اُدھر چل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جہاز کے ایک گوشہ میں ایک بچی بے فکر ہو کر اپنے کھلونے سے کھیل رہی ہے۔ مسافر نے بچی سے کہا کہ کیا تم کو پتہ نہیں کہ سمندر میں طوفان آ گیا ہے اور جہاز ڈوبنے والا ہے۔ بچی نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا: تم جانتے ہو کہ اس جہاز کا کپتان میرا باپ ہے۔ وہ کبھی اس کو ڈوبنے نہیں دے گا۔

You know, my father is the captain of this ship. He is not going to let it sink.

میں نے کہا کہ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک مومن کا ہوتا ہے۔ مومن جب کوئی کام شروع کرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے تو اس کے لیے یہ کوئی سادہ بات نہیں ہوتی۔ یہ دراصل قادر مطلق خدا کے اوپر اپنے اتھاہ بھروسہ کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا کہ مومن یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میرے کام میں خدا میرا مددگار ہے، وہ کبھی میرے کام کو بگڑنے نہیں دے گا:

I begin my work with the conviction that most merciful and all powerful God is always at my side. He will never leave me alone.

اس کے بعد ہم نے مشترک طور پر یہ دعا پڑھی: اللھم أنت الصاحب فی السفر و أنت الخلیفة فی الأھل ۔ میں نے کہا کہ اس کو پڑھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کچھ مقدس عربی الفاظ ہیں اور ان کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے کے بعد خود بخود کچھ پراسرار نتیجے ظاہر ہوں گے۔ یہ کلمہ دراصل ایک عظیم حقیقت کو اپنے دماغ میں تازہ کرنے کے لیے ہے، یہ حقیقت کہ اس دنیا میں سارا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ ہر کام اسی کی مدد سے انجام پاتا ہے۔ انسان ہر جگہ اسی کی مدد کا محتاج ہے۔ یہ بھی صرف ایک عقیدہ کی بات نہیں۔ بلکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے جس کو ہمیں ہر لمحہ یاد رکھنا چاہئے۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کے پاس صرف ایک چیز ہے اور وہ اس کا ارادہ ہے۔ اسی ارادہ کو واقعہ بنانے کے لیے ان گنت دوسرے عوامل (factors) درکار ہیں۔ اور یہ سارے عوامل پوری طرح خدا کے ہاتھ میں ہیں۔

مثلاً ہمارے پاس آنکھ ہے مگر آنکھ سے دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے جو خدا کی طرف سے آتی ہے۔ ہمارے پاس کان ہے مگر کان سے سننے کے لیے ہمیں ہوا کی ضرورت ہے جو خدا کے اختیار کی چیز ہے۔ ہم چلنا چاہتے ہیں مگر چلنے کے لیے زمینی کشش کی ضرورت ہے جس کا کنٹرول پوری طرح خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کو زندہ رہنے کے لیے پانی اور آکسیجن درکار ہے مگر پانی اور آکسیجن کی سپلائی خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ ان الفاظ کو زبان سے ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان حقیقتوں کو اپنے ذہن میں تازہ کیا جائے۔ اسی کے ذریعہ بندہ اور خدا کے درمیان تعلق قائم ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے بندہ کو وہ چیز ملتی ہے جس کو روحانی فیض کہا جاتا ہے۔

پھر جب ہماری گاڑی آگے بڑھی تو میں نے لوگوں کو ایک حدیث رسول سنائی۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: جددوا ایمانکم بقول لا الہ الا اللہ (لا الہ الا اللہ کہہ کر اپنے ایمان کی تجدید کرو) اس حدیث میں ایک بہت اہم حقیقت بتائی گئی ہے۔ اس کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لا الہ الا اللہ کے الفاظ کو زبان سے دہراتے رہو۔ اس طرح کا مفہوم اس حدیث کی تصغیر ہے۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ توحید پر

اپنے یقین کو بڑھاتے رہو۔ خدا کو بار بار دریافت کرو:

Discover your faith again and again.

پھر میں نے کہا کہ بار بار خدا کو دریافت کرنا کیا ہے۔ یہ دریافت دو طریقہ سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ آپ کی روحانیت یا ربانیت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہو کہ آپ کو بار بار نفسیاتی سطح پر ایسے تجربات پیش آئیں جب کہ آپ کو محسوس ہو کہ آپ کا رشتہ خدا سے جڑ گیا ہے۔ آپ اور خدا کے درمیان کمیونیکیشن ہونے لگے۔ یعنی وہ چیز جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: یناجی ربہ (بندہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے)۔

اس کیفیت کے حصول کا دوسرا ذریعہ وہ ہے جس کو قرآن میں توسّم (الحجر ۷۵) کہا گیا ہے۔ یعنی آس پاس کے مشاہدات سے ربانی سبق لینا۔ اپنے تجربات کو خدا اور آخرت کی یاد میں ڈھال لینا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مخلوقات کو دیکھ کر خالق کی معرفت حاصل کرنا۔ یہ صلاحیت ذہنی ارتقاء کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے اندر صحیح سوچ پیدا کر لے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ خلق کو دیکھ کر وہ خالق کو یاد کرے۔ روزمرہ کے تجربات سے وہ خدائی سبق کی غذا لیتا رہے۔

ہمارا قافلہ درختوں کے بیچ میں بنی ہوئی سڑک سے گزر رہا تھا۔ ہر لمحہ نئے مناظر سامنے آتے تھے۔ چنانچہ مادی سفر کے ساتھ ہمارا ذہنی سفر بھی برابر جاری تھا۔ میں یہ کوشش کر رہا تھا کہ مشاہدات اور تجربات میں چھپی ہوئی معنویت کو ابھاروں اور لوگوں کی ذہنی تربیت کروں۔ میرے نزدیک ذہن کی یہی وہ ربانی تربیت ہے جس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔ تزکیہ متصوفانہ قسم کے اعمال واشغال کا نام نہیں ہے بلکہ وہ مکمل طور پر ایک ذہنی سرگرمی ہے جو کھلی آنکھ اور کھلے کان کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔

تزکیہ کی یہ حقیقت حدیث میں بھی مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق، صحابیٔ رسول ابوذر غفاری کہتے ہیں: لقد ترکنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وما یحرك طائر جناحیه فی السماء الا ذکرنا منه علما (مسند احمد ۵/ ۱۵۳) ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: لقد ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما یتقلب فی السماء

طائر الا ذکرنا منه علما (۵/ ۱۶۲) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو چھوڑا اور آپ کا حال یہ تھا کہ کوئی چڑیا بھی اگر فضا میں حرکت کرتی تو آپ اس سے ہم کو ایک علم کی یاد دہانی کراتے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ تزکیہ کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ آپ یہ کرتے تھے کہ آس پاس کے واقعات میں نصیحت کے جو پہلو ہیں ان کو کھولتے اور اس طرح لوگوں کی ذہنی تربیت کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ نام ہے دنیاوی واقعات کو ربانی تجربات میں ڈھالنے کا:

Converting worldly events into divine experience.

میں نے کہا کہ ہمارا سفری کلاس تزکیہ کے اسی عمل کی ایک توسیعی شکل ہے۔ اس کی اصل خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں مومن کی ایک صفت السائحون (التوبۃ ۱۱۲) بتائی گئی ہے۔ ایک اور آیت میں کہا گیا ہے کہ زمین میں سیر کرو اور اپنے لیے عقل و بصیرت حاصل کرو (الحج ۴۶) اہل ایمان کے لیے سیاحت کی یہ صفت اتنی زیادہ اہم ہے کہ اس کو قرآن میں خواتین کی بھی مستقل صفت کے طور پر السائحات (التحریم ۵) کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔

قرآن میں جس سیر یا سیاحت کا ذکر ہے وہ عام معنوں میں ٹورزم (tourism) جیسی کوئی چیز نہیں۔ یہ ایک خالص ربانی عمل ہے۔ اس کا مطلب ہے — کسی صاحب معرفت کی ایک روحانی سیاحت:

It is a spiritual outing of a realized soul.

اس سلسلہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ حال میں مجھے یورپ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان کا خط ملا۔ انہوں نے الرسالہ کے ایک مضمون پر اعتراض کیا تھا۔ میں نے الرسالہ میں لکھا تھا کہ یہ دراصل دماغ ہے جو تمام افعال کو کنٹرول کرتا ہے۔ قلب (دل) سوچ یا احساس کا مرکز نہیں ہے، وہ صرف خون کی گردش کو جاری رکھنے والا ایک پمپنگ آرگن ہے۔ انہوں نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے دو باتیں لکھی تھیں۔

ایک یہ کہ قرآن میں قلب کو سوچ اور فکر کا مرکز بتایا گیا ہے۔ اکثر لوگ یہ بات کہتے ہیں۔ مگر یہ

درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن انسانی زبان میں اتارا گیا ہے اور دنیا کی تمام زبانوں میں پچھلے ہزاروں سال کے نتیجہ میں ایک ادبی اسلوب رائج ہوگیا ہے۔ اسی اسلوب کو قرآن میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کلام کی تاثیر ختم ہوجائے گی۔ مثال کے طور پر مغربی تعلیم یافتہ لوگ، جدید سائنسی تحقیقات کی بنا پر یہ مانتے ہیں کہ قلب صرف گردش خون کا آلہ ہے۔ مگر یہی لوگ جب بولتے یا لکھتے ہیں تو وہ ہول ہارٹڈلی (wholeheartedly) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے وہ ہول مائنڈڈلی (wholemindedly) کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔

یہ معاملہ صرف قلب کا نہیں ہے۔ قرآن میں دوسری بہت سی آیتیں ہیں جن میں کسی لفظ کو اس کے ادبی استعمال کے اعتبار سے اختیار کیا گیا ہے نہ کہ سائنسی دریافت کے اعتبار سے۔ مثلاً قرآن میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ان کے پاس کان ہیں، مگر وہ نہیں سنتے۔ ان کے پاس آنکھ ہیں، مگر وہ نہیں دیکھتے (الاعراف ۱۷۹)

اس طرح کی آیتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خود کان اور خود آنکھ کے اندر سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ سماعت اور بصارت کے الفاظ سوچ کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سنی ہوئی بات کو اپنے آپ سمجھ سکتے ہیں اور دیکھی ہوئی بات کو اپنے آپ جان سکتے ہیں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کان اور آنکھ کے اندر سوچنے اور سمجھنے کا مادہ نہیں۔ یہ دراصل دماغ ہے جو کان کے ذریعہ سنتا ہے اور آنکھ کے ذریعہ دیکھتا ہے۔ مگر یہاں دماغ کا حوالہ نہ دے کر صرف کان اور آنکھ کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ انسانی ادب میں یہ الفاظ اسی طرح رائج ہو چکے تھے۔ اس کے بجائے اگر مذکورہ آیت میں یہ کہا جاتا کہ ان کا دماغ آنکھ کے ذریعہ دیکھی ہوئی باتوں کو سمجھتا نہیں اور ان کا دماغ کان کے ذریعہ سنی ہوئی باتوں پر سوچتا نہیں، اگر بات کو اس طرح کہا جاتا تو اس کی تاثیر ختم ہوجاتی۔

اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں قرآن میں ہیں۔ مثلاً سورج کا غروب ہونا اور طلوع ہونا۔ حالاں کہ علمی تحقیق کے مطابق، طلوع اور غروب دونوں ظاہری مشاہدہ کی چیزیں ہیں۔ طلوع اور

غروب کے الفاظ میں خلائی واقعہ کا بیان نہیں۔ اس کے بجائے اگر طلوع اور غروب کے مظاہر کو فلکیاتی سائنس کی زبان میں بیان کیا جاتا تو کلام کی تاثیر ختم ہو جاتی۔ یہی معاملہ اس قسم کے دوسرے قرآنی استعمالات کا ہے۔

مذکورہ تعلیم یافتہ مسلمان نے اپنے نظریہ کی تائید میں دوسری بات یہ کہی تھی کہ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کے قلب پر کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ خوشی کے وقت بھی اور غم کے وقت بھی۔ اس سے انہوں نے یہ قیاس کیا تھا کہ انسان کا دل سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ واقعات سے متاثر ہو کر مختلف قسم کی کیفیات میں مبتلا ہوتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ اسی قسم کے احوال قلب کے علاوہ دوسرے جسمانی اعضاء پر بھی طاری ہوتے ہیں۔ مثلاً خوشی سے زمین پر پاؤں نہ پڑنا، خوف سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونا، گھبراہٹ کے وقت ہاتھ میں کپکپی طاری ہونا، ہول کے وقت آنکھوں میں اندھیرا چھا جانا، وغیرہ۔ ادبی استعمالات میں ان تمام کیفیات کو جسم کے مختلف اعضاء سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، ان کا تعلق دماغ سے ہے نہ کہ خود جسمانی اعضاء سے۔

میں روزانہ صبح کو بی بی سی لندن کی نشریات سنتا ہوں۔ میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ آج بی بی سی کی رپورٹوں میں چند باتیں بڑی سبق آموز تھیں۔ وہ میں آپ کو مختصر طور پر بتاتا ہوں۔

ایک رپورٹ سرینگر کی تعمیرات کے بارے میں تھی۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سرینگر کے اکثر مکانات اب بھی لکڑی کے ہیں۔ اس سلسلہ میں تفصیل بتاتے ہوئے رپورٹر نے ایک بڑی سبق آموز بات کہی۔ اس نے کہا کہ سرینگر لکڑیوں کا شہر ہے۔ مگر اس شہر کو دیمک نہیں کھا رہے ہیں بلکہ اس کو یہاں کے باشندوں کی بے شعوری کھا رہی ہے۔ یہ بات مختلف پہلوؤں سے درست ہے۔ کشمیر صدیوں سے ایک پرسکون علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگ عام طور پر خوش حال تھے۔ انسان کے جان و مال کو محترم سمجھا جاتا تھا۔ پورے علاقہ میں روحانی اور اخلاقی قدریں پھیلی ہوئی تھیں۔ مگر اکتوبر ۱۹۸۹ میں یہاں بے شعوری کا ایک عمل شروع ہوا۔ یہاں متشددانہ جہاد شروع کر دیا گیا۔ اس نام نہاد جہاد نے کشمیر کو ہر اعتبار سے تباہ کر دیا۔

عجیب بات ہے کہ متشددانہ جہاد شروع ہونے سے عین پہلے میں سرینگر گیا تھا۔ وہاں کے ٹیگور ہال میں میری تقریر ہوئی تھی۔ اس تقریر میں میں نے بولتے ہوئے کہا تھا کہ اگر آپ نے متشددانہ تحریک شروع کی تو اس کے نتیجہ میں آپ لوگوں کو تباہی کے سوا اور کچھ ملنے والا نہیں۔ آخر کار وہ وقت آئے گا جب کہ آپ لوگ تشدد سے عاجز آ کر امن کی بولی بولنے لگیں گے۔ اس وقت میں نے اہل سرینگر کو فارسی کا ایک شعر سنایا تھا جو اب ۱۵ سال کے بعد واقعہ بن چکا ہے۔ وہ یہ کہ جو کچھ دانش مند کرتا ہے وہی نادان بھی کرتا ہے، لیکن کافی بربادی کے بعد:

آنچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار

بی بی سی کے رپورٹر نے ایک اور خبر پاکستان کے آصف علی زرداری کے بارے میں سنائی۔ وہ سابق وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کے شوہر ہیں۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق، بے نظیر بھٹو کی حکومت کے زمانہ میں انہوں نے کافی مالیاتی دھاندھلی کی۔ یہاں تک کہ ان کو مسٹر ٹین پرسنٹ کہا جانے لگا۔ آخر کار وہ پکڑے گئے اور عدالت سے ان کے لیے قید بامشقت کا فیصلہ ہوا۔ اب ۱۱ سال کے بعد وہ ضمانت پر جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ رپورٹر نے ان سے پوچھا کہ جیل کی زندگی کے بارے میں آپ کا تجربہ کیا تھا۔ آصف زرداری نے کہا کہ جیل کی زندگی مصیبتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اب میری بیک (پیٹھ) ایسی ہوگئی ہے کہ بیٹھنا میرے لیے ایک عذاب ہے۔ رپورٹر نے مزید پوچھا کہ نوجوانوں کے لیے آپ کا میسج (پیغام) کیا ہے۔ آصف زرداری نے جواب دیا کہ میرا صرف ایک ہی میسج ہے۔ وہ یہ کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ۔ یعنی تم کوئی ایسا کام نہ کرو جو تمہاری عزت کو خطرہ میں ڈالنے والا ہو۔

''اپنی عزت اپنے ہاتھ'' کا اصول بلاشبہہ ایک قیمتی اصول ہے۔ یہ اصول قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس اہم اصول کو اکثر لوگ صرف اس وقت دریافت کرتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو بے عزت کر چکے ہوں۔ حقیقی معنوں میں اس اصول کو جاننے والا وہ ہے جو اپنے کو دوسروں کے ہاتھوں بے عزت کروانے سے پہلے اسے جان لے۔ اسی انسانی کمزوری کو ایک فارسی شاعر نے

اس طرح بیان کیا ہے کہ میں پرہیز نہ کرسکا مگر تم لوگ پرہیز کرنا:

من نکردم شما حذر بکنید

میں نے بتایا کہ بی بی سی کی ایک رپورٹ پاکستانی سیاست کے بارے میں تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے حکمراں پچاس سال سے یہ کہہ رہے تھے کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان بنیادی مسئلہ صرف ایک ہے اور وہ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ اس کے سوا تمام دوسرے مسائل ضمنی ہیں۔ پہلے کشمیر کا مسئلہ حل کرو، اس کے بعد دوسرے تمام مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے۔ اس کے مقابلہ میں انڈیا کے لیڈروں کا یہ کہنا تھا کہ کشمیر کے مسئلہ کو پرامن بات چیت کی میز پر رکھا جائے اور دوسرے تمام عملی مسائل طے کرلیے جائیں، مثلاً تجارت، تعلیم، آمد ورفت، ثقافتی تبادلہ (cultural exchange)، وغیرہ۔

یہ گویا ڈی لنکنگ (delinking) کی پالیسی تھی۔ یعنی کشمیر کے سیاسی مسئلہ کو بقیہ مسائل سے الگ کردینا۔ دوسرے مسائل کو فوراً حل کرتے ہوئے سیاسی مسئلہ کو مستقبل کے خانہ میں ڈال دینا۔ مگر پاکستان کے حکمراں اور لیڈر کسی طرح اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ انہوں نے انڈیا اور پاکستان کے درمیان نفرت کو بھڑکایا۔ انہوں نے کئی جنگیں لڑیں۔ انہوں نے پراکسی وار چلائی۔ انہوں نے کشمیر کے اشو کو انٹرنیشنلائز کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ فوج کے اوپر لگادیا۔ مگر جان ومال کی بھاری قربانی کے باوجود مثبت معنوں میں پاکستان کے حصہ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ رپورٹر نے بتایا کہ اب پاکستانی لیڈر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم یونی فوکل (uni-focal) نہیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اب انہوں نے ڈی لنکنگ کی پالیسی کو ذہنی طور پر قبول کرلیا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ ایک اچھی خبر ہے مگر میرے جیسے آدمی کو اس پر کوئی خوشی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ ان کا یہ اعتراف سارے قیمتی مواقع کو برباد کرنے کے بعد سامنے آیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں جب پاکستان ایک نئے ملک کی حیثیت سے وجود میں آیا تو وہاں کے لوگوں کے اندر زبردست جوش تھا۔ لوگ امنگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہر ایک کچھ کر ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن پاکستان کے سیکولر لیڈر اور اسلام پسند رہنما دونوں ہی اس ابتدائی ٹمپو (tempo) کو تعمیری رخ پر

لگانے میں ناکام رہے۔ اس کے بجائے دونوں ہی نے یہ کیا کہ لوگوں کے جذبات کو تخریب اور تشدد کی طرف موڑ دیا۔ اب معاملہ وہاں تک پہنچ چکا ہے جہاں سے لوگوں کے لیے یوٹرن (u-turn) لینا شاید ممکن نہیں۔

اس کے بعد میں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ کسی معاملہ میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت آرٹ آف تھنکنگ کی ہے۔ جس آدمی کے اندر آرٹ آف تھنکنگ کی صلاحیت ہو وہ معاملات کا صحیح تجزیہ کرے گا، وہ چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھے گا۔ وہ متعلق (relevant) اور غیر متعلق (irrelevant) کے فرق کو جانے گا۔ وہ اس قابل ہوگا کہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ وہ اس قابل ہوگا کہ وہ شبہہ کے عناصر (elements of doubt) کو دور کر کے چیزوں کی اصل ماہیت کو سمجھے۔ یہی وہ صحیح الفکر انسان ہے جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: ینظر بنور الله (وہ اللہ کی روشنی سے دیکھتا ہے)

ہماری گاڑی اپنی رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور سڑک کے دائیں اور بائیں دونوں طرف پھیلا ہوا سبزہ ہمیں یاد دلا رہا تھا کہ ہماری زمین کائنات کا کیسا انوکھا سیارہ ہے جہاں استثنائی طور پر پانی اور سبزہ اور ہوا جیسی زندگی بخش چیزیں موجود ہیں۔

ایک ساتھی نے سوال کیا کہ آرٹ آف تھنکنگ کی صلاحیت کو کس طرح اپنے اندر ڈیولپ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس مقصد کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کو تعصب سے خالی کرے۔ وہ اپنے آپ کو متعصبانہ طرز فکر (biased thinking) سے مکمل طور پر بچائے۔ تعصب آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھی ہوئی باتوں کو بھی نہیں دیکھتا اور سنی ہوئی باتوں کو بھی نہیں سمجھتا۔

میں نے ایک مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۱۰ نومبر ۲۰۰۴ کی صبح کو میں وائس آف امریکا (ریڈیو) سن رہا تھا۔ اس میں ایک رپورٹ آ رہی تھی جس میں ۲ نومبر ۲۰۰۴ کو ہونے والے امریکی الیکشن پر تبصرہ تھا۔ یہ الیکشن امریکی صدارت کے دو امیدواروں جان کیری اور جارج بش کے درمیان

تھا۔اس الیکشن میں جارج بش جیت گئے۔ وائس آف امریکا کے نشریہ میں مختلف ووٹروں کی آوازیں سنائی دیں۔ جارج بُش کے ایک پرجوش سپورٹر نے کہا کہ اس الیکشن کے بعد پہلی بار میں نے یہ دریافت کیا کہ خدا وہائٹ ہاؤس میں رہتا ہے:

For the first time I have discovered that God lives in White House.

ایک طرف مذکورہ امریکی ووٹر ہیں جو جارج بش کی فتح کو سچائی کی اور خدا کی فتح سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف اسی امریکا میں بسنے والے چھ ملین سے زیادہ مسلمانوں کا نظریہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے اس الیکشن کے موقع پر تقریباً متفقہ طور پر یہ مہم چلائی کہ جارج بش کو ہراؤ اور جان کیری کو جتاؤ کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق، جارج بش کی سوچی سمجھی پالیسی یہ ہے کہ مسلمانوں کو تباہ کیا جائے۔

یہی نظریہ دنیا بھر کے تقریباً تمام مسلمانوں کا تھا۔ دنیا بھر کے مسلمان خواہ عرب ہوں یا غیر عرب سب کے سب یہ کہتے تھے کہ جارج بش اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ جارج بش کی جیت مسلمانوں کی ہار ہے اور جارج بش کی ہار مسلمانوں کی جیت۔ مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے اپنے اپنے الفاظ میں یہی لکھ اور بول رہے تھے۔ اس معاملہ میں غالباً میں ساری دنیا میں واحد مسلمان تھا جو اس منفی سوچ میں شریک نہ تھا۔ میرا ماننا یہ تھا کہ کوئی بھی شخص، بشمول جارج بش اسلام کا دشمن نہیں۔ قرآن اور حدیث کے مطابق، ہر انسان ربانی فطرت پر پیدا ہوا ہے اور ہر انسان امکانی مسلم (potential Muslim) کی حیثیت رکھتا ہے، حتیٰ کہ دشمن بھی (فصلت ۳۴)

ان دونوں رایوں کا تقابل کر کے آپ سوچ سکتے ہیں کہ کس طرح تعصب انسان کے ذہن کو متاثر کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ صحیح انداز میں سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس واقعہ میں امریکی ووٹر نے بے جا محبت کی حد تک جارج بش کو اپنا سپورٹ دیا اور موجودہ مسلمان بے جا نفرت کی حد تک جارج بش کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اس ذہنی کیفیت نے دونوں کو غلو میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ دونوں ہی صحیح رائے قائم کرنے سے معذور ہو گئے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ یاسر عرفات (پیدائش ۱۹۲۹) فلسطینی تحریک کے

سب سے بڑے لیڈر تھے۔ وہ فتح (حرکۃ تحریر فلسطین) کے بانی تھے جس کو عام طور پر پی ایل او (PLO) کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اسرائیل کے خلاف اپنی متشددانہ تحریک کا آغاز ۱۹۶۹ میں کیا۔ ان کا نشانہ اسرائیل کو نیست و نابود کرنا (destruction of Israel) تھا۔ وہ اپنی دو انگلیوں سے ہمیشہ وکٹری کا نشان بنایا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اسرائیل اور امریکا کے خلاف متشددانہ واقعات کئے۔ مثلاً ہائی جیکنگ، قتل، یرغمال بنانا، سوسائڈ بامبنگ، وغیرہ۔ مگر تمام متشددانہ کارروائیوں کے باوجود فلسطینی اسٹیٹ قائم نہ ہوسکی۔ آخر کار ۱۱ نومبر ۲۰۰۴ کو پیرس کے ایک اسپتال میں شدید مایوسی کے عالم میں ان کا انتقال ہوگیا۔

یاسر عرفات کی زندگی میں بہت سے سبق ہیں۔ مثلاً انہوں نے اپنی پوری تحریک تشدد کے اصول پر اٹھائی مگر جب انہوں نے دیکھا کہ تشدد صرف فلسطینیوں کی یکطرفہ تباہی کا سبب بن رہا ہے تو انہوں نے اپنی پالیسی بدلی اور امن کے اصول پر اپنی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا مگر جن فلسطینیوں کو وہ خود اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعہ تشدد کے راستہ پر لا چکے تھے ان کو دوبارہ وہ امن کے راستہ پر لانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

میں نے کہا کہ یہی حادثہ اکثر لیڈروں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ انہوں نے ابتدائی جوش کے تحت ایک تحریک اٹھائی۔ بعد کو جب انہیں محسوس ہوا کہ وہ قابل عمل نہیں ہے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو یوٹرن (U-turn) لینے پر آمادہ کرنا چاہا مگر اس قسم کا یوٹرن ایک موٹر کار کے لیے تو ممکن ہے، مگر وہ انسان کے لیے ہرگز ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ تمام لیڈر دوبارہ ناکام ہوکر رہ گئے۔

اس سلسلہ میں ایک مزید سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بہت سے اعلیٰ صلاحیت کے لوگ پیدا ہوئے۔ مثلاً جمال الدین افغانی، امیر شکیب ارسلان، سید قطب، آیت اللہ خمینی، ڈاکٹر محمد اقبال، محمد علی جوہر، ابو الکلام آزاد، عزت بیگوویچ، وغیرہ۔ ان لوگوں نے بہت بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں اور اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ مگر یہ تمام تحریکیں سراسر بے نتیجہ ہوکر رہ گئیں۔

ان لیڈروں کی ناکامی کا مشترک سبب یہ تھا کہ انہوں نے ممکن اور ناممکن کا فرق نہیں سمجھا۔ وہ اپنی ہمالیائی کوششیں ناممکن کے میدان میں صرف کرتے رہے۔ حالانکہ اگر یہ لوگ ممکن دائرۂ عمل اور ناممکن دائرۂ عمل کے فرق کو جانتے اور ممکن دائرۂ عمل میں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتے تو یقینی طور پر ان کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوتیں اور ملت کا رکا ہوا قافلہ آگے بڑھ چکا ہوتا۔

اس کے بعد پروگرام کے مطابق ٹیم کے ہر ممبر نے اپنا کوئی تجربہ بتایا اور پھر اس تجربہ پر گفتگو ہوئی۔

۱۔ نغمہ صدیقی نے بتایا کہ حال میں پاکستان کے ڈاکٹر اسرار احمد دہلی آئے۔ یہاں ان کے کئی لکچر ہوئے۔ ۲۳ اور ۲۵ نومبر ۲۰۰۴ کو نغمہ صدیقی نے ان کے دو لکچر سنے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کرے۔ اس کے بغیر ان کا اسلام ادھورا ہے۔

میں نے کہا کہ نوآبادیاتی دور میں جب مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم ہوا تو اس کے بعد ساری مسلم دنیا میں اس کے خلاف ردعمل ظاہر ہوا۔ اس ردعمل کے دو مظہر تھے۔ ایک وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کو صرف ایک پولیٹکل اشو کے طور پر اٹھایا۔ اس کی قیادت سید جمال الدین افغانی نے کی۔ دوسرا مظہر وہ تھا جس میں اس سیاسی ردعمل کو اسلامائز کیا گیا۔ یعنی دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کو مسلمانوں کی مذہبی ڈیوٹی بتایا گیا۔ اس سیاسی تعبیر میں ایک نمایاں نام سید ابو الاعلیٰ مودودی کا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد اسی دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں نے کہا کہ سید جمال الدین افغانی کا نعرہ تھا: الشرق للشرقیین (مشرق مشرقیوں کے لیے) دوسرا مکتب فکر وہ تھا جس کے نمایاں لیڈر سید ابو الاعلیٰ مودودی تھے۔ انہوں نے اس معاملہ کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کیا۔ ان کی فکر کو ایک لفظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں: دنیا مسلمانوں کے لیے۔ یعنی مسلمان زمین میں خلیفۃ اللہ ہیں۔ ان کو حق ہے کہ وہ خدا کی نیابت میں دنیا پر حکومت کریں۔

یہ نظریہ قرآن میں بالکل اجنبی ہے۔ قرآن کے مطابق، سیاسی اقتدار ایک امتحانی پرچہ ہے

جس طرح دوسرے امتحانی پرچے ہوتے ہیں، مثلاً مال، اولاد، وغیرہ۔ اس لیے خدا باری باری مختلف گروہوں کو سیاسی اقتدار دیتا ہے تاکہ ہر ایک کو آزمائے۔ قرآن کے مطابق، اسلامی مشن کا نشانہ فرد کو اسلامائز کرنا ہے نہ کہ اسٹیٹ کو اسلامائز کرنا۔

۲۔ پریا ملک نے کہا کہ ٹیم میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپس میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت آدمی کو کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملہ میں ایک طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ رائٹ کیا ہے اور رانگ کیا ہے۔ اس طرح سوچنے کا یہ نتیجہ ہے کہ اختلاف بڑھتا ہے اور کبھی کبھی بریک ڈاؤن (breakdown) کی نوبت آجاتی ہے۔ یہ صورت حال اکثر غصہ کے وقت پیدا ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کا حل قرآن میں یہ بتایا گیا ہے: الکاظمین الغیظ ۔یعنی غصہ کو پی جانے والے۔ قرآن میں یہ نہیں فرمایا: الفاقدین الغیظ ۔یعنی وہ لوگ جن کے اندر غصہ سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ گویا اس معاملہ میں اصل چیز اینگر مینجمنٹ (anger management) ہے۔

۳۔ منجور مانی نے کہا کہ مسلمانوں میں نمبر ۷۸۶ کو مقدس مانا جاتا ہے جو کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا نمبر ہے۔ مسلمان اس نمبر کو برکت اور حفاظت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کی کیا حقیقت ہے۔

میں نے کہا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ۷۸۶ کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ نمبر نہ تو قرآن وحدیث میں بتایا گیا ہے اور نہ صحابہ وتابعین کے زمانہ میں اس کا کوئی وجود تھا۔ یہ بلاشبہہ ایک قوم پرستانہ عقیدہ ہے جو دوسری قوموں کے اثر سے لیا گیا ہے۔

۴۔ نصرت الٰہی نے کہا کہ میں نے قرآن میں یہ آیت پڑھی ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت نہیں دیتا۔ اب میں جاننا چاہتی ہوں کہ ہدایت دینے اور ہدایت نہ دینے کے لیے خدا کا اصول کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اصول قرآن میں بتا دیا گیا ہے، اور وہ ہے ھدی للمتقین (البقرۃ)

یعنی قرآن سے ہدایت ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اندر تقویٰ کی صفت رکھتے ہوں۔ تقویٰ کا

مطلب اس سیاق میں محتاط (cautious) ہونا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو ہدایت کی پروا ہو، جو ہدایت کی تلاش میں ہوں، جنھیں یہ فکر ہو کہ وہ ہدایت سے محروم ہو کر نہ رہ جائیں۔ ایسے لوگوں کو ایک لفظ میں متلاشی حق (seeker of truth) کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس طرح متلاشی حق ہوں، خدا ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان کے لیے ہدایت کا سامان کر دیتا ہے۔

۵۔ ۲۷ نومبر ۲۰۰۴ کو جب کہ ہماری گاڑی دہلی سے سہارن پور کی طرف جا رہی تھی درمیان میں اچانک پریا ملک کے موبائل ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ بمبئی کا ٹیلیفون تھا۔ پریا کی ممی نے بمبئی سے بتایا کہ پریا کے چچا پرکاش ملک (عمر 65) کا بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک عرصہ سے کینسر کے مریض تھے۔

میں نے کہا کہ اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی شخص کا انتقال ہو تو دوسرے لوگوں کو یہ کہنا چاہیے: انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔ ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب موت کی خبر ملے تو انسان کو اس سے کیا اثر لینا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت ایک ریمائنڈر (یاد دہانی) ہے۔ اس بات کی یاد دہانی کہ ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوا ہے اس کو دوبارہ اپنے خالق کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ گویا کہ ہر انسان جو اس دنیا میں آیا ہے وہ اپنا ایک ریٹرن ٹکٹ لے کر آیا ہے۔ اس ٹکٹ میں لکھا ہوا ہے: آخرت۔

موت اسی حقیقت کی یاد دہانی ہے۔ موت بتاتی ہے کہ انسان خدا کی دنیا سے آیا تھا۔ پھر وہ کچھ دن کے لیے زمین پر رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ مر کر دوبارہ خدا کی دنیا کی طرف لوٹ جاتا ہے تاکہ وہ اپنے عمل کے مطابق اپنا ابدی انجام پائے۔

۶۔ خالد انصاری نے بتایا کہ جب ہم اپنا سفر طے کر رہے تھے تو کچھ دیر کے لیے ایک ایسا ایریا آیا جہاں موبائل کے سگنل نہیں تھے۔ میں اپنے کسی ساتھی سے دہلی کنٹیکٹ کرنا چاہتا تھا لیکن موبائل کے باوجود سگنل نہ ہونے کی بنا پر بات نہ ہو سکی۔ میرا ذہن توسم کی طرف چلا گیا کہ انسان بھی ایک موبائل

فون کی طرح ہے۔ اگر اس کے دماغ میں اسپریچول سگنلس نہ ہوں تو باوجود ہر چیز کے اس کا خدا سے کنٹیکٹ نہیں ہوسکتا۔ اس کی حیثیت وہی ہے جیسے موبائل فون ہونے کے باوجود ہم کنٹیکٹ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

میں نے کہا کہ آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امکانی طور پر انسان ہر وقت خدا کے قریب ہے مگر خدا سے عملی طور پر ربط قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس کا اہل بنائے ہوئے ہو۔ اگر آدمی اپنی طرف سے اہلیت کی شرط پوری نہ کرے تو سارے امکانات کے باوجود اس کا رابطہ خدا کے ساتھ قائم نہ ہوگا۔

۷۔ مسٹر رجت ملہوترہ نے کہا کہ ہم گلوبلائزیشن کے دور میں جی رہے ہیں۔ آج پوری دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ یہ بظاہر یونیورسل یونٹی کا واقعہ ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ انسانی سماج میں اب بھی یونٹی اور ہارمنی موجود نہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں گلوبلائزیشن کا عمل صرف ٹیکنکل سنس میں ہوا ہے۔ چنانچہ موجودہ گلوبل کلچر نے ہم کو ٹیکنیکل یونٹی تو دی ہے مگر وہ ہم کو ہیومن یونٹی نہ دے سکا۔

ہیومن یونٹی کے لیے ہم کو ٹیکنیکل کلچر کے علاوہ ایک اور کلچر درکار ہے۔ یہ اسپریچول کلچر ہے۔ اسپریچول کلچر کے ذریعہ ہی یہ ممکن ہے کہ سوشل اور نیشنل اور انٹرنیشنل لیول پر ہارمنی لائی جاسکے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو مسیح نے ان لفظوں میں کہا تھا:

Man can not live by bread alone.

ٹیکنیکل یونٹی میں باہم جوڑنے کے لیے جو رول کمیونیکیشن کا ہے وہی رول انسانی یونٹی میں فرینڈ شپ کا ہے۔ ہر انسان دوسرے انسان کو اپنا دوست سمجھے۔ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے پیس ہو۔ یہی فرینڈ شپ کلچر ہے اور اسی فرینڈ شپ کلچر کے ذریعہ انسانی زندگی میں ہارمنی آسکتی ہے۔

دنیا کا نظام عملاً فرینڈ شپ کے اصول پر قائم ہے۔ مگر دنیا میں فرینڈ شپ کے دو طریقے ہیں۔ ایک، مادی اور دوسرا، اخلاقی:

In a non-religious culture, friendship is based on material interest, but in a religious culture friendship is based on moral principle.

یہ ایک فیکٹ ہے کہ فرینڈ شپ کے بغیر زندگی کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ اس لیے ہر آدمی کہیں نہ کہیں فرینڈلی بی ہیویر کو اپناتا ہے۔ مگر یہ فرینڈلی بی ہیویر عام طور پر انٹرسٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ جس عورت یا مرد کا انٹرسٹ جس سے وابستہ ہو اس کے ساتھ وہ فرینڈلی بی ہیویر اختیار کرتا ہے۔ مثلاً تاجر کا انٹرسٹ کسٹمر سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے تاجر کسٹمر فرینڈلی بن جاتا ہے۔ اسی طرح وکیل کلائنٹ فرینڈلی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر پیشنٹ فرینڈلی ہوتا ہے۔ لیڈر روڈر فرینڈلی ہوتا ہے، وغیرہ۔

یہ سب سیکٹیرین فرینڈ شپ ہے۔ اس کا عمومی فائدہ نہیں۔ یہ صرف ریلجن یا اسپرچوئلٹی ہے جو ساری انسانیت کے لیے فرینڈ شپ کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ایک سچا ریلجس آدمی یا اسپرچوئل آدمی ہمیشہ انسان فرینڈلی یا ہیومن فرینڈلی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صرف مذہب یا اسپرچوئلٹی ہے جس کے ذریعہ گلوبل فرینڈ شپ یا گلوبل ہارمنی دنیا میں قائم کی جاسکتی ہے۔

۸۔ فریدہ خانم نے دعوت اور صبر کے باہمی تعلق کے بارے میں ایک سوال کیا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پیغمبر اسلام نے اپنے عمل کا آغاز دعوت سے کیا۔ چنانچہ بالکل ابتدائی دور میں آپ پر یہ آیتیں اُتریں: یاأیها المدثر ○ قم فانذر (المدثر ۱۔۲) اس کے بعد جب آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ گئے تو وہاں بھی آپ کا پہلا خطاب ایک دعوتی خطاب تھا۔ اس خطاب میں آپ نے فرمایا: اتقوا النار ولو بشق تمر (اے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو) پھر اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں جب آپ نے حج ادا فرمایا تو وہاں بھی آپ نے دعوتی کلام کیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے اصحاب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ان اللہ بعثنی کافة للناس فادوا عنی (اللہ نے مجھے تمام انسانوں کے لیے پیغمبر

بنا کر بھیجا ہے، تو تم لوگ میرا پیغام سارے انسانوں تک پہنچادو)

یہی معاملہ صبر کا ہے۔ صبر پیغمبر کی تحریک کے مختلف مراحل میں سے ایک مرحلہ نہیں۔ وہ پیغمبر کی زندگی کا مستقل حصہ ہے۔ چنانچہ نبوت کے آغاز میں آپ کے اوپر یہ آیت اُتری: ولربك فاصبر (المدثر) اس کے بعد برابر صبر کی آیتیں اترتی رہیں۔ رمضان کا روزہ پوری عمر کے لیے ہوتا ہے اور پیغمبر نے اپنی زندگی کے آخری سال تک اس پر عمل فرمایا۔ آپ نے روزہ کے مہینہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ صبر کا مہینہ ہے (هو شهر الصبر)

جہاں تک مسلح تصادم (armed struggle) کی بات ہے وہ سراسر بے بنیاد ہے۔ مسلح تصادم کے لفظ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے خود سے فریقِ ثانی کے خلاف تصادم فرمایا۔ یہ بات سراسر بے بنیاد ہے۔ اس کے برعکس پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے: لا تتمنوا لقاء العدو واسئلوا الله العافية (تم دشمن سے مدبھیڑ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ سے امن مانگو)

اصل یہ ہے کہ خود اپنی طرف سے تصادم چھیڑنا پیغمبرانہ طریق کار کا کوئی حصہ ہی نہیں۔ قرآن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں جو چند مسلح مقابلے پیش آئے وہ تمام تر دفاعی مقابلے تھے۔ خود قرآن میں اس کی شہادت موجود ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا کہ: قاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم (البقرہ ۱۹۰) یعنی جو لوگ تمہارے خلاف جنگ چھیڑے ہوئے ہیں اُن سے لڑو۔ اسی طرح فرمایا: وهم بدؤكم اول مرة (التوبہ ۱۳) یعنی وہی لوگ ہیں جنھوں نے پہلے جنگ کا آغاز کیا، وغیرہ۔

اسلام کا نشانہ دشمن کو دشمن قرار دے کر اُس سے جنگ کرنا نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا نشانہ یہ ہے کہ حُسنِ تبلیغ کے ذریعہ دشمن کو دوست بنایا جائے۔ اسلام کی اس پالیسی کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا

ہوگیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ (حٰم السجدہ ۳۳۔۳۴)

اس کے بعد آج کے اخبارات کا اجتماعی مطالعہ کیا گیا۔ ہمارے ساتھ ۲۷ نومبر ۲۰۰۴ کے چار اخبارات تھے۔ ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، راشٹریہ سہارا (اردو) پنجاب کیسری (ہندی)

ٹائمس آف انڈیا کے پہلے صفحہ کی ایک سُرخی یہ تھی: انل امبانی کو غصہ کیوں آتا ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ دھیرو بھائی امبانی نے ریلائنس (Reliance) کے نام سے ایک کمپنی بنائی۔ اس کمپنی نے غیر معمولی ترقی کی۔ اُس نے بہت سے بڑے بڑے بزنس قائم کیے۔ یہاں تک کہ ریلائنس انڈیا کا سب سے بڑا انڈسٹریل گروپ بن گیا۔ دھیرو بھائی امبانی کے مرنے کے وقت اس کا سرمایہ تو سے ہزار کروڑ روپیہ تھا۔

دھیرو بھائی امبانی کے دو بیٹے تھے، مکیش امبانی اور انل امبانی۔ دھیرو بھائی امبانی کے مرنے کے بعد کمپنی کی ملکیت (ownership) کا سوال پیدا ہوا۔ ہندو رواج کے تحت بڑے بھائی مکیش امبانی ریلائنس کے چیرمین بن گئے۔ یہ بات دوسرے بھائی انل امبانی کو گوارا نہیں ہوئی۔ دونوں میں سخت اختلاف پیدا ہوا جو میڈیا تک پہنچ گیا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ اس اختلاف کی جڑ یہ ہے کہ انل امبانی کے لیے کمپنی میں ماتحت کردار (subordinate role) قابل قبول نہیں۔

ماضی اور حال میں جب بھی کوئی اجتماعیت ٹوٹی ہے تو اس کا سبب ہمیشہ یہی رہا ہے۔ کوئی تنظیم یا اجتماعیت جب بھی قائم ہوتی ہے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک کو چیرمین کا درجہ مل جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کے لیے ماتحت حیثیت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہی اجتماعیت کا امتحان ہے۔ سو آدمیوں میں ننانوے افراد ماتحتی پر راضی ہوتے ہیں، تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک شخص سردار بن کر نظام کو چلائے۔ نماز با جماعت کا پیغام ایک اعتبار سے یہی ہے۔ جس سماج میں اطاعتِ امیر کی یہ روح ہو وہی سماج ترقی کرتا ہے اور جو سماج اطاعتِ امیر کی روح سے خالی ہو جائے وہ سماج منتشر اور کمزور ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہندستان ٹائمس (۲۷ نومبر ۲۰۰۴) میں ایک خبر تھی۔ اس کا عنوان یہ تھا — واجپئی ہندوتو کے حق میں، مگر وہ کہتے ہیں کہ ہندوتو الیکشن کا اِشو نہیں بن سکتا:

Vajpayee endorses Hindutva But says it can't be an election issue.

بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیشنل ایگزیکیٹیو کی تین روزہ میٹنگ ۲۶ نومبر ۲۰۰۴ کو رانچی میں ختم ہوئی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے بھارتیہ جنتا پارٹی کے سینئر لیڈر اٹل بہاری واجپئی نے کہا کہ ہندوتو زندگی کا ایک فلسفہ ہے۔ مگر ہندوتو کبھی الیکشن کا اِشو نہیں بن سکتا:

Hindutva is a philosophy of life, but it can not be an electoral issue. (p. 15)

یہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے گویا اپنے سابقہ موقف سے واپسی کا اعلان ہے۔ اس کے لیڈر پہلے یہ کہتے تھے کہ ہندوتو کا تعلق ملک کی تعمیر نو سے ہے۔ وہ اس کو قومیت سے جوڑتے تھے اور اس کو کلچرل نیشنلزم کا نام دیتے تھے۔ مگر اب تجربہ کے بعد اُنہیں معلوم ہوا کہ ہندوتو کچھ ہندوؤں کی اپنی زندگی کا ایک ذاتی فلسفہ ہوسکتا ہے۔ مگر وہ ملک کی قومیت کی تشکیل کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ گویا کہ ہندوتو کچھ لوگوں کے لیے اُن کی پرائیویٹ لائف کا ضمیمہ بن سکتا ہے۔ مگر وسیع تر معنوں میں وہ قومی زندگی کی تعمیر کی بنیاد بننے کا اہل نہیں۔

کسی قوم کا کلچر کیا ہو، اس کا فیصلہ کسی پارٹی کے دفتر میں نہیں ہوتا۔ اس کا فیصلہ بین اقوامی عوامل اور تاریخ کی طاقتوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ زندگی کے اس اہم اصول کو نہ سمجھنے کی غلطی انڈیا کے ہندو پسند لیڈروں نے بھی کی ہے اور ٹھیک یہی غلطی پاکستان کے اسلام پسند لیڈروں نے بھی کی ہے۔ اور تاریخ کے قانون کے تحت دونوں ہی یکساں طور پر مکمل ناکامی کا شکار ہوئے ہیں۔ پاکستان کے اسلام پسند لیڈروں نے کہا کہ پاکستان اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے۔ اسی طرح انڈیا کے ہندو پرست لیڈروں نے کہا کہ ہندستان ہندوازم کے نام الاٹ ہو چکا ہے۔ مگر الاٹ منٹ کا یہ نظریہ دونوں جگہ صرف فرضی نعرہ ثابت ہوا۔

نئی دہلی کے اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا (۲۷ نومبر ۲۰۰۴) کی ایک خبر کا عنوان یہ تھا: تکمیل نبوت پر ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب۔ اس عنوان کے تحت جو خبر درج تھی اس کا ایک حصہ یہ ہے:

پاکستان کے ڈاکٹر اسرار احمد نے فکی آڈیٹوریم نئی دہلی میں تکمیل نبوت کے موضوع پر تقریر کی۔ اُنہوں نے کہا کہ قرآن مجید دیگر آسمانی کتب وصحائف کے برعکس انسان کے ذہنی ارتقاء کے نقطۂ عروج پر اُتارا گیا ہے۔ جہاں قرآن یعنی تکمیل ہدایت ہوچکی ہے۔ اس کے بعد اجرائے وحی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور یہ واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ اب نبوت ورسالت کی ضرورت نہیں (صفحہ ٦)

قرآن بلاشبہہ آخری کتاب ہے مگر مذکورہ استدلال درست نہیں۔ قرآن یا حدیث میں کہیں بھی نہیں بتایا گیا ہے کہ قرآن انسان کے ذہنی ارتقاء کے نقطۂ عروج پر اُتارا گیا ہے۔ یہ سراسر ایک خود ساختہ مفروضہ ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ قرآن اسی خدائی ہدایت کو لے کر اُتارا گیا ہے جو پچھلے نبیوں کو دی گئی تھی۔

مزید یہ کہ یہ ایک خطرناک نظریہ ہے۔ کیوں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن انسانیت کی روایتی دور میں اُترا، جب کہ اب انسانی دنیا ترقی کر کے سائنسی دور میں پہنچ چکی ہے۔ اسی واقعہ کو استعمال کر کے قادیانیت اور بہائیت نے نئی نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب انسانیت اپنی تاریخ کے نئے مرحلہ میں داخل ہوگئی تو اب ضروری ہوگیا کہ آج کے انسان کی رہنمائی کے لیے نیا پیغمبر ظاہر ہو۔

قرآن کا اصل امتیاز یہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت ربانی کی تکمیل ہے۔ بلکہ اس کا اصل امتیاز یہ ہے کہ وہ ہدایت ربانی کا محفوظ ایڈیشن ہے۔ قرآن کو استثنائی طور پر تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل ہے، جب کہ دوسری مذہبی کتابیں تاریخی معیار پر معتبر ثابت نہیں ہوتیں۔

ہندی روزنامہ پنجاب کیسری (۲۷ نومبر ۲۰۰۴) میں آئی انسٹیٹیوٹ اور ریسرچ سنٹر کی طرف سے ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس رپورٹ کا عنوان یہ تھا: نیتردان آپ بھی دے سکتے ہیں دوسروں کو روشنی کی سوغات۔

اس رپورٹ میں آنکھ کے عطیہ کے بارے میں ضروری تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ بہت سے لوگ جو کسی وجہ سے آنکھوں سے محروم ہوگئے ہیں آپ ان کو دوبارہ روشنی دے سکتے

ہیں وہ اس طرح کہ آپ مرنے سے پہلے تحریری وصیت کردیں کہ میری موت کے بعد میری دونوں آنکھیں نکال لی جائیں۔ اس کے بعد موت کے چھ گھنٹے کے اندر آپ کی آنکھ (eyeball) ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر نکال لیتا ہے۔ پھر اس کے بعد آپ کی آنکھ کسی نابینا آدمی کے چہرے پر لگادی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ نابینا آدمی پہلے کی طرح دیکھنے لگتا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے رپورٹ میں اس قسم کے الفاظ درج ہیں: دان میں ملی آنکھیں کسی کے جیون کو روشن بنا سکتی ہیں۔ لوگ بھی خوشیوں میں ساجھیدار بن سکتے ہیں۔ دوسروں کی زندگی میں روشنی بھرنے کے لیے آوشیک ہے کہ آپ اپنی آنکھیں دان کریں۔ آپ کا نیتر دان کسی کے جیون کو روشن کرسکتا ہے۔ آپ کے دان سے سبھی اندھوں کو آنکھیں مل جائیں گی۔ (صفحہ ۳)

اس اخباری رپورٹ کو پڑھ کر میں نے کہا کہ بلاشبہہ یہ کام ایک قابل تعریف انسانی خدمت ہے۔ جن لوگوں نے اس طبی امکان کو دریافت کیا اور جو لوگ اس امکان کو عملی صورت دینے کے لیے سرگرم ہیں وہ سب یقیناً ایک اچھا کام کررہے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ میں نے سوچا کہ اسی نوعیت کی ایک زیادہ بڑی خدمت وہ ہے جس کے لیے کوئی تڑپنے والا نہیں۔ مادی آنکھ سے محروم لوگوں کو روشنی کا تحفہ دینے کے لیے ساری دنیا میں بڑی بڑی تحریکیں اور بڑے بڑے ادارے کام کررہے ہیں۔ مگر بے شمار لوگ ایک اور روشنی سے محروم ہیں اور کوئی نہیں جو لوگوں کو یہ روشنی فراہم کرنے کے لیے سرگرم ہو۔ یہ سچائی کو دیکھنے والی آنکھ سے محرومی تندرست آنکھوں والے لوگ بھی اس دوسرے پہلو سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ مگر ان کے اندھے پن کو دور کرنے کی کسی کو فکر نہیں۔

اس طرح ہمارا کارواں سڑکوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ڈیڑھ سو کیلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد ہم لوگ سہارنپور شہر میں داخل ہوئے۔ سفر کے دوران ہی موبائل ٹیلی فون کے ذریعہ سہارنپور کے منتظمین کو اطلاع دے دی گئی تھی۔ ڈاکٹر محمد اسلم اور دوسرے لوگ گھنٹہ گھر کے پاس مل گئے۔ ان کے ساتھ چل کر ہمارا قافلہ پنجاب ہوٹل میں پہنچا جہاں ہم لوگوں کے قیام کے لیے منتظمین نے پانچ کمرے بک کرلئے تھے۔

یہاں پہنچ کر ہم لوگوں نے پہلے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ یہ نماز ہوٹل کے ایک بڑے کمرہ میں پڑھی گئی۔ اس میں ہمارے قافلہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک ہو گئے۔ اس طرح یہ کافی بڑی جماعت بن گئی۔ جماعت جب کھڑی ہوئی تو کچھ لوگ دوڑ کر دھلی ہوئی سفید چادریں لے آئے تاکہ اس کو بچھا کر اس پر نماز پڑھی جاسکے۔ میں نے کہا کہ نماز پڑھنے کے لیے دھلی ہوئی چادروں کی ضرورت نہیں بلکہ دھلی ہوئی روح کی ضرورت ہے۔ سب سے اچھی نماز وہ ہے جو دل کی صفائی کے ساتھ پڑھی جائے۔

جماعت کے بعد میں نے مختصر طور پر بتایا کہ نماز کی حقیقت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ نماز کا ایک فارم ہے۔ مگر نماز سے خدا کو جو اصل چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اندر تواضع (modesty) پیدا ہو۔ میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (العنکبوت ۴۵)

میں نے کہا کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ نماز ادا کرنے سے اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ فحش اور منکر چیزیں نمازی کی زندگی سے ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ دراصل معیاری نماز کا ذکر ہے نہ کہ نتیجۂ نماز کا۔ یعنی سچی نماز کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایک نئی سوچ پیدا کرے اور اس سوچ کے تحت وہ بالقصد فحش اور منکر جیسی چیزوں کو چھوڑ دے۔

دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد ہوٹل کے ایک بڑے کمرہ میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اس پریس کانفرنس کے لیے تین بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ اخبار کے لوگ ٹھیک ۳ بجے وہاں پہنچ گئے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ منتظمین نے باقاعدہ طور پر صرف چار اخبار کے نمائندوں کو دعوت نامہ بھیجا تھا۔ مگر اخباری حلقہ میں میری آمد کی خبر پہنچ گئی اور بیشتر اخباروں کے نمائندے اپنے آپ یہاں آ گئے۔

پریس کانفرنس نہایت معتدل ماحول میں ہوئی۔ لوگوں نے ہر قسم کے ملکی اور ملی سوالات کئے اور میں نے ان کے سوالات کا اپنے انداز میں جواب دیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے بتایا کہ

ہمارا مشن کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے ملک میں جو دھواں دھار سیاست چلائی گئی اس کے دو الگ الگ دھارے تھے۔ ایک دھارے کے لیڈر مہاتما گاندھی تھے، اور دوسرے دھارے کے لیڈر مسٹر محمد علی جناح تھے۔ اپنے مقصد کے اعتبار سے یہ دونوں دھارے ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر دونوں کا طریق کار ایک تھا۔ دونوں کا ایک مفروضہ حریف تھا اور دونوں اپنی سیاسی مہم اس مفروضہ حریف کے خلاف جاری کئے ہوئے تھے۔ گاندھی کا حریف انگریز تھا اور جناح کا حریف ہندو۔ دونوں اپنے اپنے انداز میں اپنے سیاسی حقوق کے لیے اپنی مہم چلا رہے تھے۔

دونوں بڑے لیڈروں کا یہ طریق کار بعد والوں کے لیے رجحان ساز (trendsetter) بن گیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ کے بعد ملک میں جتنی بھی تحریکیں اٹھیں وہ سب کی سب اپنے حقوق کے مطالبہ پر مبنی تھیں۔ کوئی بھی تحریک اپنے فرائض کی ادائیگی کی بنیاد پر نہیں چلائی گئی۔ اس طرح پورے برصغیر ہند کا سماج رائٹ کانشس (right conscious) سماج بن گیا، جب کہ صحت مند سماج وہ ہے جو ڈیوٹی کانشس (duty conscious) سماج ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈیوٹی کانشس سماج ہی تعمیری سماج ہے۔ ایسا ہی سماج تعمیر و ترقی کی راہ میں آگے بڑھتا ہے۔ جس سماج میں لوگ اپنے حقوق (ادھیکار) مانگنے لگیں وہاں نتیجہ کے اعتبار سے صرف انارکی پیدا ہوگی۔ فطرت کا قانون ہے کہ فرض (ڈیوٹی) ادا کرنے والوں کو ان کے حقوق اپنے آپ مل جاتے ہیں اور جو لوگ اپنے حقوق کے لیے چیخ پکار کریں ان کو کچھ بھی نہیں ملتا۔

میں نے کہا کہ ہمارا مشن ایک اعتبار سے یہ ہے کہ ہم اس سماجی سفر کو دوبارہ ایک نیا رخ دینا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا سماج حق شناس سماج بنے۔ وہ صرف حقوق شناس سماج بن کر نہ رہ جائے جیسا کہ آج نظر آتا ہے۔

یہ پریس کانفرنس ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک چلی۔ مختلف اخباروں کے نمائندے نہایت دلچسپی کے ساتھ اپنے اپنے سوالات کرتے رہے اور میں ان کے جوابات دیتا رہا۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ ملک کی کس پارٹی کو سب سے اچھی پارٹی مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسٹر ارون شوری نے ایک بار

میرے بارے میں کہا تھا کہ: مولانا صاحب، ہمارے ہندستانی فیملی کے ایلڈر ممبر ہیں۔ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں اور ملک کے ہر شہری کے لیے میرے دل میں وہی جذبات ہیں جو ماں کے دل میں اپنی اولاد کے لیے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک ماں کے کئی بیٹے ہوں اور آپ اس سے پوچھیں کہ تمہارا کون سا بیٹا تم کو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اس کے جواب میں یقیناً ماں یہ کہے گی کہ مجھے تو اپنا ہر بیٹا اچھا لگتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں ملک کی ہر پارٹی کو یکساں طور پر شفقت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں اپنے دل میں ہر ایک کے لیے نیک تمنائیں پاتا ہوں۔

ایک اخبار نویس نے سوال کیا کہ عام طور پر لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمان اس ملک میں ایک پچھڑی ہوئی قوم بن گئے ہیں۔ وہ ترقی کے دور میں بہت پیچھے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں لوگ اپنی رائے میڈیا کے ذریعہ بناتے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، میڈیا سنسنی خیز خبروں (sensational news) کی انڈسٹری ہے۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نسبت سے کوئی سنسنی خیز نیوز وجود میں آئے تو میڈیا اس کو نمایاں کرتا ہے حالاں کہ عین اسی وقت مسلمانوں میں بہت سی تعلیمی اور تعمیری سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر میڈیا میں ابھی تک ان کو جگہ نہیں ملی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے ان کو کئی تعلیمی اور تعمیری سرگرمیوں کا حوالہ دیا جو ابھی تک میڈیا میں جگہ نہ پا سکیں۔ میں نے اپنی گفتگو میں بیڈ نیوز کا استعمال کر دیا تھا اس پر ایک اخبار نویس نے بیڈ نیوز کے لفظ پر اعتراض کیا۔ میں نے اس کے جواب میں اپنے بیان کی تصحیح کرتے ہوئے کہا کہ بیڈ نیوز سے میری مراد سنسنی خیز خبر (sensational news) تھی۔ میری اس مراد کو اخبار نویس حضرات نے تسلیم کر لیا اور گفتگو معمول کے مطابق چلنے لگی۔

ایک سوال بابری مسجد کے بارے میں تھا۔ میں نے کہا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے نمائندے آپس میں بات چیت کر کے طے کر لیں وہ ایک خیالی بات کرتے ہیں۔ کیوں کہ دونوں فرقوں میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کو اس کے فرقہ کی طرف سے نمائندگی کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہو۔ میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا قابل عمل حل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عدالت اس معاملہ میں ایک واضح

فیصلہ دے اور دونوں فریق اس فیصلہ کو مان لیں۔ مثال کے طور پر اگر عدالت اس معاملہ میں جگہ کی منتقلی (re-location) کا فیصلہ دے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس فیصلہ کو مان لیں اور مسجد کے ری لوکیشن پر راضی ہو جائیں۔

سہارن پور کی جرنلسٹ یونین کے صدر مسٹر چرن جیولال شام کو دوبارہ آکر مجھ سے ہوٹل میں ملے۔ انہوں نے کہا کہ اس سے پہلے میں آپ کے بارے میں اور مسلمانوں کے بارے میں نگیٹیو خیالات رکھتا تھا۔ مگر آج پریس کانفرنس کے موقع پر آپ نے جس طرح تمام باتوں کی وضاحت کی اس کے بعد میرا مائنڈ بالکل صاف ہو گیا۔ اب میں آپ اور مسلمان دونوں کے بارے میں پازیٹیو مائنڈ سے سوچنے لگا ہوں۔ سہارن پور میں آپ مجھ سے جو کام چاہیں لے سکتے ہیں۔

پریس کانفرنس کے بعد میں اپنے کمرہ میں آگیا۔ یہاں دوبارہ بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ نشست کی صورت میں یہ سلسلہ رات کے بارہ بجے تک جاری رہا۔ درمیان میں صرف کھانے اور نماز کا وقفہ ہوا۔ ان نشستوں میں لوگوں کی طرف سے جو سوالات آئے وہ مختلف اور متنوع قسم کے تھے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی سب باتیں ہم کو ٹھیک معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے دل کو اپیل کرتی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کچھ مسلمان آپ کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملہ کی حقیقت ہم کو سمجھائیے کیوں کہ ہم اس کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ جو شخص بھی آپ کو میری مخالفت کرتا ہوا ملے آپ اس سے پوچھیں کہ کیا تم کبھی ان سے ملے ہو اور اختلافی بات پر ان سے ڈسکشن کیا ہے۔ تقریباً ہر مخالف یہ کہے گا کہ ہم ان سے کبھی نہیں ملے۔ البتہ دوسروں سے سن کر یا اخباروں میں پڑھ کر ان کے بارے میں رائے بنائی ہے۔ اس کے بعد آپ ان لوگوں سے بھی گفتگو کیجئے جو مجھ سے ملے ہوں اور براہ راست طور پر میری باتیں سنی ہوں۔ پھر آپ ایسے لوگوں سے پوچھئے کہ ان کو کیا اختلاف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ہر ایک یہ کہے گا کہ مجھے تو ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اسی

ذاتی تجربہ سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ مخالفین کس حد تک درست ہیں۔ یہ لوگ سنی سنائی باتوں پر اپنی رائے بنائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں سے آپ صرف یہ کہیں کہ تم جا کر ان سے ملو اور براہِ راست ان سے ان کے نظریہ کو سمجھو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد ایسے لوگوں کے اختلافات ختم ہو جائیں گے۔

۱۸ نومبر کی صبح کو ہم لوگوں نے ہوٹل میں جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ہمارے قافلہ کے لوگ میرے کمرے میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حسب معمول دین کے مختلف موضوعات پر گفتگو جاری ہوگئی۔ سب سے پہلے میں نے کہا کہ اس وقت فجر کی نماز میں میں نے سورہ الکہف کی آیتیں تلاوت کی ہیں۔ ان میں آپ نے وہ آیت سنی جس کا ترجمہ یہ ہے: کہو کیا میں تم کو بتاؤں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت ہوگئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ (الکہف ۱۰۳۔۱۰۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسے عمل میں مشغول ہو سکتا ہے جو اُس کے اپنے نزدیک بظاہر ایک اچھا عمل ہو۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک ایسا عمل ہوگا جو خدا کے نزدیک سرے سے کوئی قیمت نہ رکھتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں سب سے پہلا کام یہ جاننا ہے کہ پسندیدہ عمل کا معیار (criterion) کیا ہے۔ لوگ یہ کرتے ہیں کہ بطور خود ایک معیار مقرر کر لیتے ہیں جو ان کے اپنے عمل پر صادق آتا ہو اور پھر اپنے ذہن کے مطابق، خود ساختہ طور پر ایک پسندیدہ عمل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے عمل کے معاملہ میں خدائی معیار کو دریافت کرے اور پھر اُس کے مطابق اپنے عمل کو بنائے۔

مثال کے طور پر کچھ لوگ اپنے مقرر کردہ معیار کے مطابق، سوشل سروس کو بہت اچھا کام سمجھتے ہیں — ان لوگوں کے نزدیک مدر ٹریسا اس معاملہ میں ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ ایک خود ساختہ نظریہ ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق، سماجی خدمت یقیناً ایک اچھا کام ہے۔ مگر جب دعوتِ آخرت کا کام نہ ہو رہا ہو تو ایسی حالت میں سماجی خدمت کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ جو لوگ مدر ٹریسا کے ماڈل کو لے کر سماجی خدمت میں مشغول ہوں اُن کے بارہ میں کہا جائے گا کہ لوگوں کو

وقتی عذاب سے بچانے کے کام کو تم نے سب سے بڑا کام سمجھا۔ حالاں کہ سب سے بڑا کام یہ تھا کہ لوگوں کو ابدی عذاب سے بچانے کی کوشش کی جائے۔

کمرے کے دروازہ پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا گیا تو سہارن پور کے مسٹر شکیل احمد شمسی ملنے کے لیے آئے تھے۔ وہ ہماری مجلس میں شریک ہوگئے۔ انہوں نے کئی سوالات کئے۔

ان کا ایک سوال یہ تھا کہ قرآن کے متن اور اس کے حاشیہ (تفسیر) میں فرق ہے یا دونوں ایک ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج کل ہر گروہ کی ایک پسندیدہ تفسیر ہے جو ان کے اکابر نے لکھی ہے۔ ہر گروہ اپنی پسندیدہ تفسیر کو اسی طرح مقدس سمجھتا ہے جس طرح وہ قرآن کے متن کو مقدس سمجھتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کا عقیدہ بالکل بے بنیاد ہے۔ کسی بھی شخص کی تفسیر قرآن کے متن کا بدل نہیں ہوسکتی۔ خواہ وہ مفروضہ اکابر کی لکھی ہوئی ہو یا دوسرے لوگوں کی لکھی ہوئی۔ میں نے کہا کہ ہر تفسیر کی حیثیت مفسر کے اجتہاد کی ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ مجتہد کی رائے صحیح بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی ہوسکتی ہے۔ (المجتهد يخطئ ويصيب)

ان کے کچھ سوالات فقہی اختلافات کے بارے میں تھے۔ مثلاً انہوں نے پوچھا کہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں دو فریقوں کے درمیان جو نزاع ہے وہ بالکل غیر ضروری ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ لا صلوٰة إلا بقرأة فاتحة الكتاب (الترمذی، احمد) یعنی ہر نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن میں یہ آیت ہے کہ: واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الاعراف ۲۰۴) دونوں کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حدیث میں فاتحہ کا عمومی حکم بتایا گیا ہے۔ یعنی ہر نماز میں فاتحہ ضروری ہے۔ اور قرآن کی آیت میں اس صورت حال کا حکم ہے جب کہ قرآن بلند آواز سے پڑھا جارہا ہو۔

ان دونوں حکموں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ عام حالات میں ہر نمازی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کو پڑھے۔ یہ عام حکم ہے لیکن جب جماعت کی نماز ہورہی ہو اور امام جہری

قرأت کررہا ہو تو اس وقت امام کی قرأت تمام مقتدیوں کی طرف سے نمائندہ قرأت ہوگی۔ اب سورہ فاتحہ کا سننا کافی ہوجائے گا نہ کہ اس کو اپنی زبان سے دہرانا۔ گویا کہ ایک قرأت اگر اصالۃً قرأت ہے تو دوسری قرأت نیابۃً قرأت۔

میں نے کہا کہ امام کی قرأت کے وقت جلدی جلدی فاتحہ کے الفاظ کو دہرانا ایک غیر سنجیدہ فعل ہے۔ ایسے غیر سنجیدہ فعل کا عبادت سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسری بات یہ کہ سرّی نمازوں میں مقتدی خاموشی کے ساتھ فاتحہ کی قرأت کرسکتا ہے۔ اس قرأت کے لیے قرآن کی آیت مانع نہیں۔ کیوں کہ قرآن کی آیت میں اس صورت حال کا ذکر ہے جب کہ مقتدی اپنے امام کی زبان سے قرأت کی سماعت کررہا ہو۔ سماعت نہ کرنے کی صورت میں حدیث کا حکم قابلِ عمل ہوجائے گا، یعنی مقتدی کا خاموشی کے ساتھ فاتحہ کی قرأت کرنا۔

اس موقع پر ایک بات میں نے یہ کہی کہ ملاقات کے کچھ آداب ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص کسی سے ملے تو اس کو یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ کیا آپ نے مجھ کو پہچانا۔ اس قسم کا سوال آداب ملاقات کے خلاف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ملاقات کے لیے آنے والا آدمی خود ہی اپنا تعارف بتائے یا اپنا کارڈ دے دے۔ اکثر لوگ اس معاملہ میں آداب ملاقات کا لحاظ نہیں کرتے اور ایسے سوالات کرنے لگتے ہیں جو دونوں ہی کے لیے شرمندگی کا باعث ہوں۔

ہوٹل کے کمرہ میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور مختلف دینی موضوعات پر باتیں ہورہی تھیں۔ ساڑھے سات بجے کمرہ کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ہوٹل کے رسپشن سے پوچھا گیا کہ آپ لوگ صبح کے ناشتہ میں کیا لیں گے۔ ہمارے ساتھی اپنے اپنے چوائس کے مطابق، مختلف فرمائش کرنے لگے۔ میں نے لوگوں کو سختی سے روکا۔ میں نے کہا کہ ناشتہ یا کھانا بھوک مٹانے کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ لذت اور پسند کے لیے۔ آپ لوگ لذت اور ضرورت میں فرق کرنا سیکھئے اور فارسی مقولہ کے مطابق، اس اصول کو پکڑ لیجئے کہ: خوردن برائے زیستن نے زیستن برائے خوردن (کھانا جینے کے لیے ہے، نہ کہ جینا کھانے کے لیے)۔

پھر میں نے لوگوں کو اصولِ تفسیر کی نسبت سے ایک بات بتائی۔ میں نے کہا کہ قرآن کی ایک آیت یہ ہے: فاقرء وا ما تیسر من القرآن (المزمل ۲۰) یعنی قرآن سے پڑھو جتنا تم کو آسان ہو۔ اس آیت کا براہِ راست تعلق تہجد کی نماز سے ہے۔ اس کا براہِ راست مفہوم یہ ہے کہ تہجد کی نماز میں قرأت کے معاملہ میں تیسیر کا اصول اختیار کرو۔ یعنی بہ آسانی جتنا ممکن ہو اُتنا قرآن سے پڑھو۔

اس آیت میں تیسیر کا لفظ آیا ہے۔ تیسیر کے لفظی معنیٰ ہیں، آسان کرنا۔ یہاں تیسیر کا لفظ اپنے ابتدائی مفہوم کے لحاظ سے تہجد کی قرأت کے لیے ہے۔ مگر اپنے توسیعی مفہوم کے لحاظ سے اُس کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے۔ مثلاً کھانے میں تیسیر یہ ہے کہ وہ کھانا کھایا جائے جس کی فراہمی آسان ہو۔ سونے میں وہ بستر استعمال کیا جائے جو آسانی سے میسر ہو سکے۔ سفر میں وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو مسافر کے لیے آسانی کے ساتھ قابلِ عمل ہو، وغیرہ۔ قرآن کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے اس اصول کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ قرآن کے معانی کا بہت بڑا حصہ قاری کے لیے غیر معلوم ہو کر رہ جائے گا۔

۱۸ نومبر کی صبح کو ۱۰ بجے ہم سب کو ہوٹل سے دہرہ دون روڈ کے اس مقام پر لے جایا گیا جہاں نیشنل میڈیکل کالج بنایا گیا ہے۔ آج اس کالج کا افتتاح تھا اور اسی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے مجھے سہارنپور بلایا گیا۔ یہ کالج یونانی اور آیورویدک تعلیم اور ریسرچ کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کالج کے بانی اور روح رواں ڈاکٹر محمد اسلم ہیں۔ یہ اُن کی خوش قسمتی ہے کہ سہارنپور میں اُن کو بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعاون حاصل ہے۔ ان معاونین میں گروجی کا نام سرِ فہرست ہے۔ اُنہوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی ہے۔

یہ میڈیکل کالج ایک خوبصورت علاقہ میں قائم ہے۔ اُس کے ایک طرف ندی بہہ رہی ہے اور اُس کے دوسری طرف دور تک سرسبز درختوں کے مناظر ہیں۔ تعمیرات کا ایک حصہ بن چکا ہے اور بقیہ حصوں پر کام ہو رہا ہے۔ میں نے اُس کے مختلف حصوں کو چل کر دیکھا۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ خدایا، اس ادارہ کی خصوصی مدد فرما اور اس کو ترقی دے کر ایک بڑا ادارہ بنا دے۔

کالج کے گراؤنڈ میں شامیانہ کے نیچے ایک جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں یہاں موجود تھے۔ پہلے افتتاح کی رسم ادا کی گئی جس کی صورت یہ تھی کہ میں نے ایک رسّی کھینچی۔ اس کے بعد ایک پردہ ہٹا اور دیوار میں لگی ہوئی سنگی تختی سامنے آ گئی۔ اُس کے بعد میں نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کی اور کہا کہ خدایا، اس ادارہ کی خصوصی مدد فرما اور اس کو اعلیٰ ترقی کے منازل تک پہنچا دے۔

اس کے بعد ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ میں نے کہا کہ یہ میڈیکل کالج ملک میں ایک نئے دور کی علامت ہے۔ اور وہ یہ کہ اس ملک میں علیٰحدگی پسندی کا دور ختم ہو گیا۔ اب ہندو اور مسلمان دونوں نے متفقہ طور پر یہ طے کیا ہے کہ وہ باہم مل کر ملک کی تعمیر کریں گے۔

یہ میڈیکل کالج یونانی اور آیورویدک دونوں کی تعلیم اور ریسرچ کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں طبّی تعلیم حاصل کریں گے اور قومی اتحاد کی ایک نئی تاریخ کا آغاز کریں گے۔ اس اعتبار سے یہ کالج صرف ایک کالج نہیں بلکہ وہ ملکی تعمیر کے لیے گویا ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد ہم لوگ شامیانہ کے تحت بنے ہوئے اسٹیج پر آ گئے۔ یہاں مختلف لوگوں کی تقریریں ہوئیں۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ تعلیم زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے۔ تعلیم کی اہمیت کے بارہ میں مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مسدّس میں بجا طور پر یہ کہا تھا کہ:

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے　　کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

پھر میں نے کہا کہ ایک تعلیمی ادارہ صرف تعلیمی ادارہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اسی کے ساتھ اس کے بہت سے مزید فائدے ہیں۔ مثلاً تعلیمی ادارہ انٹرایکشن (اختلاط) کا میدان ہے۔ یہاں مستقل طور پر ہر مذہب اور ہر کلچر کے نوجوان ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ڈسکشن کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے درمیان لین دین کرتے ہیں۔ یہ انٹرایکشن اپنے آپ میں ایک بہت بڑا کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ علیٰحدگی کی پالیسی اختیار کر کے ترقی نہیں کر سکتا۔ ترقی کا راز

دوسروں کے ساتھ مل کر آگے بڑھنا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر ایک عجیب رجحان پیدا ہوا ہے کہ ہر جگہ وہ اپنا علیحدہ پاکٹ بنانے کی تحریکیں چلا رہے ہیں جس کو پاکستانائیزیشن کہا جاسکتا ہے۔ یہ رجحان ترقی کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظریہ کا ایک عملی ثبوت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ۵۷ مسلم ممالک ہیں۔ مگر مسلمان جس تیزی سے ہندستان میں ترقی کر رہے ہیں، ویسی ترقی کسی بھی مسلم ملک میں اب تک ممکن نہ ہوسکی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندستان میں دو موافق چیزیں موجود ہیں — بڑا ملک اور چیلنج۔ اور ترقی کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر محمد اسلم صاحب نے تقریر کی۔ اُنہوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ پہلے میں سیاسی ذہن کا آدمی تھا۔ ایم ایل اے، ایم پی اور منسٹر بننے کو بڑی چیز سمجھتا تھا۔ مگر میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میری زندگی کو بدل دیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ میرے کلینک میں ایک مریض آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ ماہنامہ الرسالہ ہے۔ میں نے اس رسالہ کے صفحۂ اول کی مختصر عبارت پڑھی اور پھر مجھے اُس سے دلچسپی ہوگئی۔ میں نے مریض سے وہ رسالہ لے لیا اور ایک ہی نشست میں اس کو پڑھ ڈالا۔

اس کے بعد مجھے الرسالہ سے اتنی دلچسپی ہوئی کہ میں نہ صرف اُس کا مستقل قاری بن گیا بلکہ اُس کی ایجنسی لے کر اس کو پھیلانے لگا۔ اُنہوں نے بتایا کہ الرسالہ کے مطالعہ نے میرا ذہن مکمل طور پر بدل دیا۔ میرا سیاسی ذہن ختم ہوگیا اور میں پُر امن تعمیر کی لائن پر سوچنے لگا۔ اسی فکری انقلاب کا ایک مظہر یہ ہے کہ میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے یہ میڈیکل بنایا۔ یہ کارروائی ایک بجے تک جاری رہی۔

اس کے بعد کالج ہی کے اندر دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے دوران مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے بعد دو بجے ہمارا قافلہ کار کے ذریعہ سہارنپور سے دہلی کے لیے روانہ ہوا۔

۲۸ نومبر کو ظہر کی نماز میڈیکل کالج کے گراؤنڈ میں بنے ہوئے پختہ چبوترہ پر ادا کی گئی۔ اس کے بعد ہمارا قافلہ بذریعہ کار سہارنپور سے دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے لوگوں سے کہا کہ مومن کے لیے ہر واقعہ آخرت کی یاد دہانی ہے۔ ہم لوگ دہلی سے سہارنپور آئے اور

اب سہارنپور سے دہلی جارہے ہیں۔ یہ گویا علامتی طور پر آخرت سے دنیا میں آنا تھا اور اب ہم گویا دنیا سے آخرت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ قرآن کی زبان میں یہی توسم ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیے کہ آپ اپنی ذہنی تربیت اس طرح کریں کہ زندگی کے ہر تجربہ میں آپ کو خدا اور آخرت کی یاد آئے۔ آپ کو بار بار جنت اور دوزخ کا منظر دکھائی دے۔ مادی واقعات میں آپ کو روحانیت کی غذا حاصل ہو۔ آپ کو ایسا محسوس ہو گویا کہ آپ کی ملاقات بار بار اپنے رب سے ہورہی ہے۔ آپ کے لیے ہر سفر ایک ایسا سفر بن جائے جیسے کہ آپ اپنے خدا کی طرف جارہے ہیں۔

اس کے بعد ہم لوگوں نے حسب پروگرام آج کے اخبارات کا اجتماعی مطالعہ شروع کیا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۸ نومبر ۲۰۰۴) میں مختلف خبریں تھیں۔ ان میں سے ایک خبر وہ تھی جس کا عنوان یہ تھا — انل امبانی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مندر گئے:

Anil visits Tirupati with wife and sons.

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ریلائنس انڈسٹری کے وائس چیرمین اور مینیجنگ ڈائرکٹر انل امبانی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تروپتی کے وِنکٹیشور مندر میں گئے۔ وہاں انہوں نے یہ پرارتھنا کی کہ ان کے خاندان میں امن آئے۔ کمپنی کی اونرشپ کے بارے میں اپنے بھائی مکیش امبانی کے ساتھ انل امبانی کی نزاع پیدا ہوگئی ہے۔ ریلائنس گروپ کا سرمایہ تو سے ہزار کروڑ روپیہ ہے۔ انل امبانی مندر میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ گئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے مندر میں یہ پرارتھنا کی کہ میرے خاندان میں امن اور عافیت قائم ہو۔ میرے باپ دھیرو بھائی امبانی کے زمانہ کی روایات خاندان میں باقی رہیں۔ انل امبانی نے حال میں اپنے بھائی مکیش امبانی کے خلاف کمپنی کا چیف بننے پر سوال اٹھایا ہے اور خود کمپنی کے چیف بننے کا دعویٰ کیا ہے۔ (صفحہ ۹)

یہ پرارتھنا (دعا) کا ہندو تصور ہے۔ ہندو مذہب میں دیوتا عملاً لوگوں کی مادّی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لوگ اپنے دنیوی مسائل کے لیے مندروں میں جاتے ہیں۔ اسی کے اثر سے بہت سے مسلمان بھی اپنی دنیوی حاجتوں کے لیے درگاہوں میں جانے لگے ہیں۔ مگر یہ اسلام کا طریقہ

نہیں۔ اسلام میں دعا خدا اور بندے کے درمیان ربط کا ذریعہ ہے۔ کوئی بندہ جب خدا سے مربوط ہوجائے تو اس کے اندر تواضع اور بے غرضی کی صفت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسا آدمی، اپنی نفسیات کے مطابق، کسی تنظیم کے اونر بننے سے بھاگتا ہے نہ کہ وہ اس کے حصول کے لیے دعا کرے۔ کیوں کہ اسلام کے مطابق، اس قسم کی اونرشپ ایک ذمہ داری کا عہدہ ہے نہ کہ بڑائی کا عہدہ۔ حقیقی خدا پرست کبھی ایسی ذمہ داری کا خواہش مند نہیں ہوسکتا جو اس کی مسئولیت (accountability) کو بڑھاتا ہو۔

اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا (۲۸ نومبر ۲۰۰۴) کی ایک خبر کا عنوان یہ تھا: امریکا میں پہلا مسلم ٹی وی چینل شروع۔ اس عنوان کے نیچے یہ خبر درج تھی:

''امریکا میں پہلا مسلم ٹی وی چینل شروع ہوگیا ہے۔ انگریزی زبان میں دکھایا جانے والا یہ چینل کیبل کے ذریعہ ٹیلی کاسٹ ہوگا۔ اس کا نام ''برج ٹی وی (Bridge T.V.)'' ہے۔ اس کے بانی مسٹر مزمل پاک نژاد امریکی شہری ہیں۔ وہ ۱۹۷۹ میں پاکستان سے امریکا آئے۔ انہوں نے آئی اے این ایس کو بتایا کہ دسمبر ۲۰۰۱ کو ایک ریڈیو پروگرام کے ذریعہ مسلمانوں کے بارے میں توہین آمیز باتیں سنتے ہوئے میں نے یہ عزم کرلیا تھا کہ ہمیں ایک مسلم ٹی وی چینل شروع کرنا ہے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعہ کے بعد یہ عزم اور راسخ ہوگیا۔ انہوں نے بتایا کہ آغاز میں کیبل کے ذریعہ اسے ۵۰ ہزار ناظرین کے پاس پہنچایا جائے گا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں ہے''۔ (صفحہ ۱)

اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس قسم کا مسلم ٹی وی اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز ممکن ہے وہ یہ کہ کچھ مسلمان اس کو دیکھنے لگیں۔ جہاں تک مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کا تعلق ہے، ان کا ازالہ اس سے ہونے والا نہیں۔ اس لیے کہ اس قسم کا ٹی وی غیر مسلموں کی نظر میں وکالت ٹی وی ہوگا نہ کہ برج ٹی وی۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی نفسیاتی کمزوری ہر حال میں اپنے کو درست سمجھنا (self-righteousness) ہے۔ اس قسم کا ٹی وی صرف یہ کام کرے گا کہ وہ مسلمانوں کی اس نفسیاتی کمزوری کو بڑھا کر اصل مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنادے گا۔

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کا نہیں ہے بلکہ خود مسلمانوں کی غلط روش کا ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ کچھ مسلمان عملاً تشدد کی کارروائی میں مبتلا ہیں۔ بقیہ مسلمان ان غلط کارروائی کی مذمت نہیں کرتے اس لیے وہ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ان کی تائید کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں موجودہ زمانہ کے سارے ہی مسلمان اسلام کی غلط نمائندگی کے مرتکب ہورہے ہیں۔ اب کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں کی منفی سوچ اور ان کی متشددانہ کارروائی کو کھلے طور پر غلط بتایا جائے اور کسی عذر کے بغیر ان کی تصحیح کی کوشش کی جائے۔ مذکورہ قسم کا وکیلانہ انداز کچھ مسلمانوں کو خوش کرسکتا ہے مگر وہ کسی بھی حال میں اصل مسئلہ کو حل کرنے والا نہیں۔

ایک صاحب نے سعودی عرب کے اخبار العالم الاسلامی کا شمارہ ۲۲ نومبر ۲۰۰۴ دکھایا۔ اس کے صفحۂ اول کی ایک خبر کا عنوان یہ تھا: تحریر فلسطین عاجلاً لا آجلا۔ (فلسطین کی آزادی جلد نہ کہ بدیر) یہ پاکستان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی تقریر کے الفاظ تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں یہ کہا تھا کہ یاسر عرفات کے خواب انصاف پر مبنی تھے اور وہ خواب ضرور پورے ہوں گے، جلد نہ کہ بدیر: مادام أن احلامه بنيت على العدالة فانها ستحقق عاجلاً لا آجلا (صفحہ ۱)

یہ محض ایک لفظی خطابت ہے۔ ۱۹۴۸ میں جب اسرائیل کا قیام وجود میں آیا اور صہیونی مسئلہ پیدا ہوا اس وقت عرب کے اندر اور عرب کے باہر بہت سے مقرر اور محرر پیدا ہوئے جو اسی قسم کے الفاظ پر جوش طور پر لکھتے اور بولتے تھے۔ مگر آدھی صدی سے زیادہ مدت کی قربانی کے باوجود فلسطینیوں کا خواب پورا نہیں ہوا بلکہ حالات پہلے سے زیادہ خراب ہوگئے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی کام نہیں کہ انہی الفاظ کو دہرایا جاتا رہے۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ آزادی فلسطین کی تحریک پر نظر ثانی کی جائے۔ اب ضرورت اس معاملہ کے ازسرِ نو جائزہ (re-assessment) کی ہے نہ کہ پرجوش الفاظ بول کر لوگوں کو خوش کرنے کی۔ اس دنیا میں کسی مہم کی کامیابی کی شرط امکان ہے نہ کہ انصاف۔

میں نے کہا کہ ہر شخص اپنے ذاتی معاملہ میں بار بار یہی کرتا ہے کہ جب اس کا ایک منصوبہ

ناکام ہوجاتا ہے تو وہ پورے معاملہ کا ازسرِ نو جائزہ لیتا ہے۔ وہ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ مگر جب معاملہ ملّی مسئلہ کا ہو تو یہی لوگ اپنے ذاتی تجربہ کو بھول جاتے ہیں۔ ملّی معاملہ میں ہر آدمی بار بار انہی الفاظ کو دہراتا ہے جو ماضی کے تجربہ میں اپنی ناکامی کو ثابت کر چکے ہیں۔ شاید لوگ ملی معاملہ میں اس طرح سنجیدہ نہیں جس طرح وہ اپنے ذاتی معاملہ میں سنجیدہ ہوتے ہیں۔

۲۸ نومبر کے تقریباً تمام اخبارات میں میرے سہارن پور کے پروگرام کی خبریں چھپی تھیں۔ یہاں ان کی تفصیل درج نہیں کی جاسکتی۔ البتہ کچھ اخبارات کی رپورٹنگ کی سرخیاں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

کرتبوں کا بودھ کرانا ہمارا مشن (امر اجالا)

شنکر آچاریہ کے ساتھ سمّان جنک بیوہار ضروری (دینک ودھ مانو)

ٹکرانا سمسیا کا سمادھان نہیں (شاہ ٹائمس)

باہمی گفتگو بابری مسجد تنازعہ کا حل نہیں (راشٹریہ سہارا)

کیوں استھانانترت نہیں ہوسکتی بابری مسجد (سہارن پور جاگرن)

واپسی کا سفر دہرہ دون روڈ کے ذریعہ طے ہوا۔ درمیان میں ہم لوگ چیتل گرانڈ (ریستوران) میں ٹھہرے۔ یہاں مغرب کی نماز ادا کی گئی۔ ساتھیوں نے چائے پی۔ یہ ریستوران اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ ایک خوبصورت گارڈن معلوم ہوتا ہے۔ اس کی صفائی اور اس کے خوبصورت ماحول کی وجہ سے یہاں لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی کثرت سے یہاں آتے ہیں۔

ہماری گاڑی اونچی نیچی سڑکوں پر ہلتی ہوئی چل رہی تھی اور ہماری گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ میرے لیے یہ سفر ایک مصیبت کا سفر بن گیا کیوں کہ میں ایک کار سک (car sick) آدمی ہوں۔ کار میں لمبے سفر سے میرے سر میں چکر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ اس سفر میں بھی سر کا چکر شروع ہوگیا۔ تاہم جس گاڑی سے ہمارا یہ سفر ہوا اس میں پیچھے کی طرف لیٹنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے سفر کا زیادہ حصہ لیٹ کر طے کیا۔ لیٹنے کی صورت میں میرے چکر میں کافی کمی آجاتی ہے۔ اس کے لیے میں

نے کئی دوائیں استعمال کیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ عجیب بات ہے کہ مجھے کسی دوسرے سفر میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ پیدل کا سفر، بیل گاڑی کا سفر، گھوڑے گاڑی کا سفر، کشتی کا سفر، ریل کا سفر، جہاز کا سفر، غرض کسی بھی دوسرے سفر میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ مگر کار خواہ وہ کتنی ہی اچھی ہو، اس سے میرے سر میں چکر آنے لگتا ہے۔

چیتل گرانڈ میں کچھ دیر قیام کے بعد ہم لوگ آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ غازی آباد کے پاس پہنچ کر سڑک پر بھیڑ بہت بڑھ گئی۔ ہر طرف بس کاریں ہی کاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ چنانچہ یہ سفر تقریباً رینگتے ہوئے طے ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہندو عقیدہ کے مطابق آج مبارک دن تھا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں شادیاں کیں تاکہ ان کی شادی بابرکت رہے۔ روزنامہ اخبار مشرق (۲۸ نومبر ۲۰۰۴) میں اس واقعہ کی خبر حسب ذیل الفاظ میں درج تھی:

''شادیوں کے اس موسم میں جب دہلی کے چودہ ہزار جوڑے یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ سب سے زیادہ مبارک دن پر شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے تو پھر یہ ایک قدرتی بات ہے کہ پنڈتوں، ہوٹلوں کے مالکوں، کھانے بنانے والوں اور پھول اور گلدستے فراہم کرنے والوں کی خدمات بہت مہنگی ہو جائیں گی۔ لیکن دہلی کے بھیڑ بھاڑ اور ٹریفک جام کے مدنظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پنڈت، بارات یا مہمان مقررہ وقت پر مقرر جگہ پر نہیں پہنچ سکے تو پھر کیا ہوگا۔ ۲۸ نومبر شادیوں کے لیے سب سے مبارک دن مانا گیا ہے۔ اسی لیے اس ایک دن میں شادیوں کی اتنی تقریبات ہو رہی ہیں کہ اگر کوئی شخص اس دن ایک سے زیادہ شادیوں میں شرکت کرنا چاہتا ہے تو اس کو ٹریفک کی وجہ سے کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ لیکن اگر ٹریفک جام ہوا تو یہ دوڑ بیکار ثابت ہوگی اور بندھن کی نیک ساعت گزر جائے گی۔ پنڈت رگھوناتھ شاستری کو دہلی کے مختلف علاقوں میں تین شادیوں میں مذہبی فرائض انجام دینے ہیں۔ انہیں اس بات کی بہت فکر ہے کہ کیا وہ تین جگہوں پر وقت پر پہنچ سکیں گے یا نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے سال بھی انہوں نے تین جوڑوں کو شادی کے بندھن میں باندھا تھا

لیکن ہر جگہ وہ بہت مشکل سے مہورت کے وقت پہنچ سکے تھے۔ اسی قسم کی صورتِ حال کا سامنا ایک انجینئر راہل سنگھ کو ہے جو جمنا پار کے علاقہ میں رہتا ہے۔ اس کے دو قریبی رشتہ داروں کے ہاں شادیاں دہلی شہر کے دو مختلف محلوں میں ہوں گی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ٹریفک جام کی وجہ سے وہ ان تقریبوں میں کیسے شرکت کر سکے گا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ان شادیوں میں نہ جائے۔ مختلف اندازوں کے مطابق، ہر شادی پر تقریباً دس لاکھ روپیہ خرچ آئے گا۔ اس طرح اتوار کے روز چودہ ہزار شادیوں پر کل چودہ ارب روپیہ خرچ ہوں گے''۔ (صفحہ ۱)

دہلی سے سہارنپور کا فاصلہ ۱۶۵ کیلومیٹر ہے۔ جاتے ہوئے ہم لوگ دہلی سے صبح ۸ بجے روانہ ہوئے تھے۔ مگر سہارنپور پہنچے تو گھڑی میں ڈیڑھ بج چکے تھے۔ یہی صورت مزید اضافہ کے ساتھ واپسی میں بھی پیش آئی۔ مختصر سفر میں اتنا زیادہ وقت اس لیے لگا کہ سڑک شروع سے آخر تک بہت خراب تھی۔ ہماری گاڑی مسلسل ہچکولوں کے درمیان چل رہی تھی۔ میرے سر میں درد ہونے لگا۔ ایک دیش بھکت شاعر کا شعر ہے: میرے دیش کی دھرتی سونا اگلے، اگلے ہیرے موتی۔

یہ شعر مجھے یاد آیا اور پھر اپنے موجودہ تجربہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو میں نے اس طرح مکمل کیا:

میرے دیش کی دھرتی سونا اگلے، اگلے ہیرے موتی
میرے دیش کے لیڈر کانٹا بوئیں، بوئیں ٹوٹی سڑکیں

۲۸ نومبر کی رات کو میں دہلی واپس آگیا۔ ۲۹ نومبر کی صبح کو ایک صاحب ملنے کے لیے آئے۔ یہ جے بھگوان تھے جو ہماری اس کرایہ کی گاڑی کے ڈرائیور تھے جس کے ذریعہ ہم لوگ دہلی سے سہارن پور گئے اور سہارن پور سے دہلی واپس آئے۔ جے بھگوان نے کہا کہ سہارنپور میں آپ کے بھاشن میں نے سنے تھے۔ ان سے میں بہت پربھاوت ہوا تھا۔ آپ اپنی ہندی کی کچھ پستک پڑھنے کے لیے مجھے دیجئے۔ تاکہ میں اور زیادہ جانکاری لے سکوں۔ چنانچہ ان کو ہندی کی دو کتابیں دی گئیں۔

خدا کے گواہ

قرآن کی سورہ نمبر ۳ کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے: اگر تم کو کوئی زخم پہنچے تو دشمن کو بھی ویسا ہی زخم پہنچا ہے۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔ تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ لوگوں کو گواہ بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا (آل عمران ۱۴۰)

قرآن کی ایک اور آیت سورہ نمبر ۴۵ میں آئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے (المؤمن ۵۱)

ان آیات میں گواہ (witness) سے مراد قیامت میں پیش کیے جانے والے خدائی گواہ ہیں۔ قرآن کے مطابق، گواہ یا شاہد کا درجہ پیغمبر کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ پیغمبر کا مقام یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے براہِ راست خدا کی وحی وصول کرتا ہے اور اس کو انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ گواہ یا شاہد کا رول یہ ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی منصوبہ کا عملی نمونہ بننے کا کام کرتا ہے۔

سڑکوں پر راستہ بتانے کے لیے کھمبے ہوتے ہیں۔ ان کو نشانِ راہ (sign post) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح شاہد بھی ایک خدائی نشانِ راہ (sign post of God) کا کردار ادا کرتا ہے۔ ایسا انسان گویا خدائی بُرہان ہے۔ وہ اُن عذرات (excuses) کی تردید بنتا ہے جن کو لے کر لوگ سچائی سے دور ہو جاتے ہیں۔ لوگ طرح طرح کے کنفیوژن اور شبہات میں پڑ کر اپنے آپ کو سچائی سے محروم کر لیتے ہیں۔ شاہد بھی انہی شبہات اور کنفیوژن کے ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر وہ اُن سے باہر آ کر یقین کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ قیامت میں ایسا شخص گواہی کا رول ادا کرے گا۔ خدا لوگوں سے کہے گا کہ تم شبہات کا عذر لے کر سچائی سے دور رہے۔ مگر اس انسان کی مثال بتاتی ہے کہ تمہارا عذر جھوٹا عذر تھا۔ تم بھی اُسی طرح شبہات کے جنگل میں یقین کو دریافت کر سکتے تھے۔ پھر اُس کی طرح تم نے بھی ایسا کیوں نہیں کیا۔

اسی طرح ایک بندۂ مومن مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مایوسی میں مبتلا

نہیں ہوتا بلکہ وہ خدا کے فیصلہ پر راضی رہ کر اپنے اندر مثبت شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ ایسا شخص بھی قیامت میں خدائی گواہ بنے گا۔ جو لوگ مصیبتوں کا نام لے کر مایوسی اور بے اعتمادی کا شکار ہوئے، خدا ان سے کہے گا کہ میرے اس بندے کو دیکھو، وہ بھی تمہاری طرح مصیبتوں میں مبتلا ہوا۔ مگر اُس نے ہر مصیبت کا سامنا مثبت نفسیات کے ساتھ کیا۔ اُس نے اپنے اندر منفی نفسیات کی پرورش نہیں ہونے دی۔

اس گواہی کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے۔ اس کا تعلق ہر اُس صورت حال سے ہے جس کو لے کر لوگ سچائی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو کنفیوژن کا شکار ہوتے ہیں یا سچائی کا انکار کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں خدا کا جو بندہ ان حالات سے دوچار ہو۔ مگر وہ اپنے آپ کو منفی احساس سے بچائے۔ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ اُس کے یقین کو متزلزل نہ کرے۔ وہ دنیا میں خدا کے گواہ کا کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ قیامت کے دن خدائی گواہ (witness of God) کے طور پر کھڑا کیا جائے گا۔ وہ اپنے عمل سے عذرات لنگ کی تردید بن جائے گا۔ خدا لوگوں سے کہے گا کہ جن باتوں کو لے کر تم بدگمانی اور شک اور انکار میں مبتلا ہوئے وہ سب کچھ میرے اس بندہ کے ساتھ بھی دنیا میں پیش آیا۔ مگر کوئی بھی ناپسندیدہ تجربہ اس کو سچائی کے راستہ سے نہ ہٹا سکا۔

ایسے شاہدین آخرت میں پیغمبروں کے ساتھ جگہ پائیں گے۔ وہ اس بات کی عملی مثال بن جائیں گے کہ دنیا میں لوگ جن شبہات کے حوالہ سے سچائی کو اختیار نہ کر سکے وہ سب بے بنیاد عذرات تھے۔ خدا ایسے لوگوں کے عذرات کو قبول نہیں کرے گا۔ اُن کے حق میں سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ خدا کی عدالت میں وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں قرار پائیں گے۔ جب کہ مذکورہ قسم کے گواہ جنت کے ابدی انعامات سے سرفراز کیے جائیں گے۔

انسان کی منزل

ڈاکٹر الکسس کیرل ۱۸۷۳ میں فرانس میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ سائنسی تعلیم کے بعد انہوں نے اپنے کیریر کا بیشتر حصہ امریکا میں گزارا۔ ۱۹۱۲ میں ان کو میڈیسن کا نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۴۴ میں ان کا انتقال ہوا اور فرانس میں ان کے وطن میں ان کی تدفین ہوئی۔

ڈاکٹر الکسس کیرل کی ایک کتاب ۱۹۳۵ میں انسان نامعلوم (Man The Unknown) کے نام سے چھپی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ اس کتاب کے بارے میں اس کے ایک تبصرہ نگار نے درست طور پر لکھا ہے کہ: یہ کتاب خالص سائنسی اعتبار سے انسان اور اس کی زندگی کے بارے میں مصنف کے تجربات کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔

This book sums up much of his experience of man and his life seen from the purely scientific aspect.

۳۱۲ صفحہ کی اس کتاب میں ڈاکٹر الکسس کیرل انسانی زندگی کی حقیقت معلوم کرنے میں ناکام رہے۔ چنانچہ اپنی اس کتاب کا ٹائٹل انہوں نے ان الفاظ میں مقرر کیا ہے: انسان نامعلوم (Man The Unknown)

اس کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جہاں تک انسان بحیثیت ایک سائنسی وجود کا معاملہ ہے اس کو ڈاکٹر الکسس کیرل بڑی حد تک دریافت کر چکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی کتاب کا نام انسان نامعلوم کیوں رکھا۔ ایسا ایک کنفیوژن کی بنا پر ہوا۔ الکسس کیرل نے ''انسان'' کو تو معلوم کر لیا تھا مگر ان کا مطالعہ ان کو یہ نہ بتا سکا کہ اس انسان کی منزل کیا ہے۔ ان کو محسوس ہوا کہ ایک معلوم انسان ایک غیر معلوم منزل کی دنیا میں جی رہا ہے۔ اور یہی ان کی عدم معرفت کا اصل سبب ہے۔ اس اعتبار سے کتاب کا زیادہ صحیح ٹائٹل یہ ہوگا: نامعلوم منزل (Goal The Unknown)

یہ صرف ڈاکٹر الکسس کیرل کا مسئلہ نہیں۔ یہی تمام فلاسفہ اور مفکرین کا مسئلہ ہے۔ انسان

بظاہران کے لیے ایک معلوم چیز تھی۔ مگر اس معلوم انسان کی منزل کیا ہے، وہ ان کے لیے آخری حد تک غیر معلوم رہی۔ انسان اور اس کی منزل کے درمیان یہی فکری خلا ہے جو ہزاروں سال سے انسان کو سرگرداں کئے ہوئے ہے۔ مگر آخر میں کنفیوژن کے سوا کسی کو کچھ نہیں ملا۔ یہ ایک لائف ڈیفائننگ (life defining) سوال ہے اور اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کا تشفی بخش جواب دریافت کیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ یہ فلاسفہ اور مفکرین انسان کی منزل اسی آج کی دنیا میں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ جب کہ آج کی دنیا میں وہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ دنیا ایک نامکمل دنیا ہے، جب کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک مکمل دنیا کا طالب ہے۔ انسان حیات ابدی چاہتا ہے، جب کہ قبل از موت کی اس دنیا میں حیات ابدی کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔ انسان مسرتوں کی دنیا چاہتا ہے مگر اس دنیا میں طرح طرح کے ناموافق حالات اس کے پرمسرت دنیا بننے میں لازمی رکاوٹ ہیں۔ انسان آئیڈیل دنیا چاہتا ہے مگر یہاں وہ ایک غیر آئیڈیل دنیا میں رہنے پر مجبور ہے۔ انسان پیدائشی طور پر پرفیکشنسٹ (perfectionist) ہے۔ وہ ایک پرفیکٹ ورلڈ چاہتا ہے مگر ساری کوششوں کے بعد وہ صرف یہ دریافت کرتا ہے کہ یہاں پرفکٹ ورلڈ کا ملنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو چیز غیر معلوم ہے وہ انسان نہیں ہے۔ غیر معلوم چیز دراصل انسان کی منزل ہے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ دنیا جو انسان کے خوابوں کی تعبیر ہو، جو ہر قسم کے تضاد سے خالی ہو، جہاں انسان پورے فل فلمنٹ (fulfillment) کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جی سکے۔

یہ بظاہر ناقابلِ حل مسئلہ اس وقت واضح طور پر حل ہو جاتا ہے جب کہ انسان کا مطالعہ خدائی اسکیم کی روشنی میں کیا جائے۔ یعنی مخلوق کو سمجھنے کے ساتھ خالق کی منشا کو بھی سمجھا جائے۔ یہی اس معاملہ میں سائنٹفک طریقہ ہے۔ جب اس حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا مسئلہ صرف اس لیے ہے کہ خدا کے کریشن پلان (creation plan) کو سامنے رکھے بغیر انسان کو سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

انسان ایک مخلوق ہے، وہ خود خالق نہیں، جس طرح مشین ایک مصنوع (make) ہے، وہ خود

اپنی صانع (maker) نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کی حقیقت کو جاننے کے لیے خالق کے تخلیقی نقشہ کو جاننا ضروری ہے۔ انجینئر کے منصوبہ کو جانے بغیر مشین کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح خالق کے تخلیقی نقشہ کو جانے بغیر انسان کی توجیہہ کرنا ممکن نہیں۔ اس تخلیقی نقشہ کو سامنے رکھے بغیر انسان کی زندگی اور اس کی معنویت ناقابل فہم رہتی ہے۔ لیکن اس تخلیقی نقشہ کو سمجھنے کے بعد ہر چیز پوری طرح قابل فہم بن جاتی ہے۔ ہر چیز اپنا صحیح مقام پالیتی ہے۔

Everything falls into place.

اصل یہ ہے کہ خدا نے اپنے تخلیقی نقشہ کے مطابق، دنیا کو ایک جوڑا دنیا (pair world) کی شکل میں بنایا ہے۔ ایک وہ دنیا جس میں ہم پیدا ہونے کے بعد رہتے ہیں۔ دوسری وہ دنیا جہاں ہم موت کے بعد چلے جاتے ہیں۔ اس طرح انسانی زندگی کے دو حصے ہیں، ایک قبل از موت پیریڈ (pre-death period) اور دوسرا بعد از موت پیریڈ (post-death period)۔ انسانوں کو اس کے پیدا کرنے والے نے ایک ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ مگر اس نے اس کی زندگی کو دو مرحلوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ قبل از موت اور بعد از موت۔

موت سے پہلے کی دنیا آزمائشی مقام (testing ground) کے طور پر بنائی گئی ہے اور موت کے بعد کی دنیا دار الجزاء (world of reward) کے طور پر۔ موجودہ دنیا چونکہ ٹسٹ کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے یہاں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں ہر چیز ناقص اور محدود صورت میں ہے۔ گویا کہ موجودہ دنیا ایک قسم کا اگزامینیشن ہال (examination hall) ہے۔ یہاں ٹسٹ دینے کے بقدر ضروری سامان موجود ہیں مگر پر مسرت زندگی گزارنے کے لیے جو اعلیٰ چیزیں درکار ہیں وہ یہاں موجود نہیں۔ اگزامینیشن ہال کے اندر کوئی طالب علم اپنی مطلوب زندگی کی تعمیر کرنا چاہے تو اس کو صرف مایوسی ہوگی۔ یہی مایوسی ان لوگوں کو ہو رہی ہے جو موجودہ ٹسٹ کی دنیا میں اپنے مطلوب مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

قبل از موت دنیا میں کسی عورت یا مرد کو کیا کرنا ہے کہ وہ بعد از موت دنیا میں اپنی مطلوب دنیا (desired world) پاسکے، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو خالق کے منشا کے مطابق استعمال کرے۔

بعد از موت زندگی کے لیے خدا نے ایک مکمل دنیا بنائی ہے جس کا نام جنت ہے۔ یہ جنت ہر اعتبار سے آئیڈیل اور پرفکٹ ہے۔ اس جنت میں بسانے کے لیے خدا کو ایسے عورت اور مرد درکار ہیں جو جنت کی اس دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ موجودہ دنیا میں جو آدمی اپنے آپ کو خدائی معیار کے مطابق کوالیفائی (qualify) کرے گا وہ جنت کی معیاری دنیا میں بسایا جائے گا۔

یہ کوالیفائڈ عورت اور مرد کون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے خدا کی معرفت حاصل کریں۔ جو فکری کنفیوژن سے باہر آ کر سچائی کو دریافت کریں۔ جو غیر خدا کی پرستش کو چھوڑ کر خدا کے پرستار بنیں۔ جو آزادی کے باوجود اپنے آپ کو خدائی ڈسپلن میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جو منفی حالات میں اپنے اندر مثبت شخصیت کی تعمیر کریں۔ جو دوسروں کے ساتھ بھی وہی اخلاقی معاملہ کریں جو وہ اپنے ساتھ چاہتے تھے۔

خدا کے کریشن پلان کے مطابق، یہی معیار (criterion) ہے۔ جو عورت یا مرد اس معیار پر پورے اتریں وہ موت کے بعد ابدی جنت میں بسائے جائیں گے۔ اور جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں وہ موت کے بعد ابدی جہنم (hell) میں ڈال دئے جائیں گے جہاں ان کے لیے حسرت اور مایوسی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اہل جنت کا کیس ان لوگوں کا کیس ہے جنھوں نے آج کی دنیا کے مواقع (opportunities) کو استعمال (avail) کیا اور اہل جہنم ان لوگوں کا کیس ہے جو موجودہ دنیا کے مواقع کو استعمال (avail) نہ کر سکے۔ ان کا کیس محروم مواقع (missed opportunities) کا کیس قرار پائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ کوئی موقع صرف ایک بار تمہارا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ ابدی کامیابی کے معاملہ میں یہ قول پوری طرح درست ہے۔ کیوں کہ یہ موقع کسی کو بھی دوسری بار ملنے والا نہیں۔ جن لوگوں کا کیس مواقع کو استعمال کرنے والے (opportunities availed) کا کیس قرار پائے گا وہ بھی ہمیشہ کے لیے ہوگا اور جن لوگوں کا کیس مواقع کو کھونے والے (opportunities missed) کا کیس ہوگا وہ بھی ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ اس معاملہ میں ہر ایک کے لیے ناکامی بھی ابدی ہوگی اور کامیابی بھی ابدی۔

الرسالہ کی نئی مطبوعات

● سیرتِ رسول	صفحات	۱۷۲
● امنِ عالم	صفحات	۲۰۸
● عورت: معمارِ انسانیت	صفحات	۲۵۰
● مطالعۂ حدیث	صفحات	۳۲۰

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

دی اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

خط و کتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 2834 6079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323

ناگپور میں مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

Khalil Kirana Store
Teka Badi Masjid, Siddarth Nagar
Teka, Nagpur-440017, MS

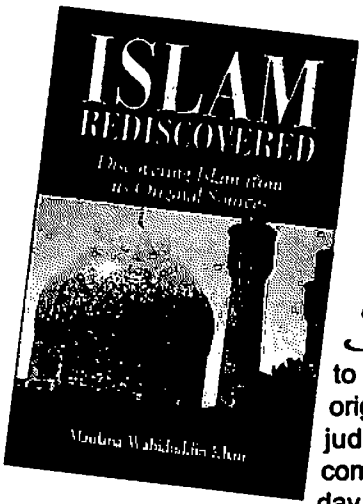

ISLAM
REDISCOVERED
Discovering Islam from its Original Sources

By Maulana Wahiduddin Khan

Rs. 180.00 ISBN: 81-87570-40-7

This book seeks, as its title suggests, to present Islam as it is, by drawing on original sources, rather than leaving it to be judged by latter-day interpretations and commentaries, or the practices of present-day Muslims in different parts of the world. This method of evaluation brings out the distinction between Islam as presented to the world by the Prophet Muhammad and his Companions (information about which is available to us in the Qur'an and the sunnah) and Islam as mirrored in the lives of later Muslim generations.

GOODWORD BOOKS

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13, Tel. 2435 5454
Fax: 2435 7333, e-mail: info@goodwordbooks.com, www.goodwordbooks.com

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$20/£10	$10/£5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$35/£18	$18.£8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$50/£25	$25/£12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$80/£40	$40/£18

Goodword Books Pvt. Ltd.

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013

Tel. (9111) 2435 6666, 2435 5454, Fax (9111) 2435 7333, e-mail: info@goodwordbooks.com

ORDER FORM (URDU BOOKS)

QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES
	60.00	مضامین اسلام		12.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)		400.00	تذکیر القرآن (مکمل مجلد)
	10.00	باغ جنت		80.00	ڈائری (جلد اول)		250.00	تذکیر القرآن (پیپر بیک)
	10.00	نار جہنم		65.00	کتاب زندگی		85.00	اسباق تاریخ
	10.00	سچا راستہ		25.00	اقوال حکمت		60.00	تعمیر حیات
	10.00	دینی تعلیم		10.00	تعمیر کی طرف		50.00	تعمیر انسانیت
	10.00	خلیج ڈائری		20.00	تبلیغی تحریک		125.00	سفرنامہ نیوزی لینڈ اسفار جلد اول
	10.00	رہنمائے حیات		25.00	تجدید دین		125.00	سفرنامہ نیوزی لینڈ اسفار جلد دوم
	10.00	تعدد ازواج		35.00	عقلیات اسلام		80.00	اسلام: ایک تعارف
	60.00	ہندستانی مسلمان		25.00	قرآن کا مطلوب انسان		60.00	اللہ اکبر
	10.00	روشن مستقبل		10.00	دین کیا ہے؟		50.00	پیغمبر انقلاب
	10.00	صوم رمضان		20.00	اسلام دین فطرت		65.00	مذہب اور جدید چیلنج
	8.00	اسلام کا تعارف		10.00	تعمیر ملت		35.00	عظمت قرآن
	20.00	علما اور دور جدید		10.00	تاریخ کا سبق		60.00	عظمت اسلام
	60.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین		8.00	فسادات کا مسئلہ		10.00	عظمت صحابہ
	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے		8.00	انسان اپنے آپ کو پہچان		80.00	دین کامل
	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ		8.00	تعارف اسلام		45.00	الاسلام
	10.00	یکساں سول کوڈ		8.00	اسلام پندرہویں صدی میں		50.00	ظہور اسلام
	10.00	اسلام کیا ہے؟		12.00	راہیں بند نہیں		40.00	اسلامی زندگی
	40.00	میوات کا سفر		10.00	ایمانی طاقت		35.00	احیاء اسلام
	35.00	قیادت نامہ		10.00	اتحاد ملت		65.00	راز حیات
	8.00	منزل کی طرف		20.00	سبق آموز واقعات		40.00	صراط مستقیم
	125.00	اسفار ہند		10.00	زلزلہ قیامت		60.00	خاتون اسلام
	100.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹		12.00	حقیقت کی تلاش		50.00	سوشلزم اور اسلام
	70.00	قال اللہ وقال الرسول		8.00	پیغمبر اسلام		30.00	اسلام اور عصر حاضر
	90.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱		10.00	آخری سفر		40.00	الربانیۃ
	80.00	مطالعہ قرآن		10.00	اسلامی دعوت		45.00	کاروان ملت
	40.00	مذہب اور سائنس		20.00	حل یہاں ہے		30.00	حقیقت نخ
	100.00	دین و شریعت		25.00	امہات المومنین		35.00	اسلامی تعلیمات
	60.00	مطالعہ سیرت		85.00	تصویر ملت		25.00	اسلام اور جدید کا خالق
	10.00	خدا اور انسان		50.00	دعوت اسلام		40.00	حدیث رسول
	8.00	ہندستان آزادی کے بعد		40.00	دعوت حق		35.00	راہ عمل
	100.00	مسائل اجتہاد		80.00	نشری تقریریں		80.00	تعبیر کی غلطی
	120.00	مطالعہ حدیث		60.00	دین انسانیت		25.00	دین کی سیاسی تعبیر
	100.00	امن عالم		50.00	فکر اسلامی		10.00	عظمت مومن
	100.00	عورت: معمار انسانیت		50.00	شتم رسول کا مسئلہ		8.00	اسلام: ایک عظیم جد و جہد
				8.00	طلاق اسلام میں		8.00	تاریخ دعوت حق

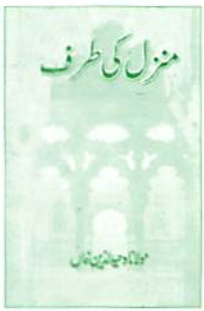

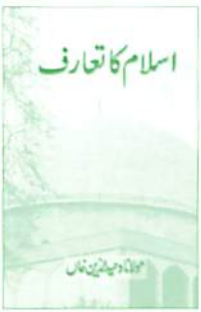

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2003-05
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2003-05